هفت روزہ
الفتح
کراچی

۱۰-۱۷ مارچ ۱۹۷۸

منصوبہ بندی کے تحت یا ....
مضمون صفحہ ۱۲ پر

فیصلہ محفوظ

قیمت دو روپے پچاس پیسے

اسلامی جمعیت طلبہ کا عوام دشمن کردار

گذشتہ دنوں چانڈکا میڈیکل کالج میں اسلامی جمعیت طلباء کے ناظم اعلیٰ لیاقت بلوچ آئے ہوئے تھے چانڈکا کے یونٹ نے بھی طلباء میں کھویا ہوا وقار بحال کرنے کیلئے ایک چائے پارٹی کا اہتمام کیا۔ اس تقریب میں سرکاری کرسیاں استعمال کی گئی تھیں۔

لیاقت بلوچ نے تقریر میں فرمایا ہمارے حکمرانوں نے بھی اسلام کی افادیت کو تسلیم کر لیا ہے لیاقت بلوچ نے کہا کہ ہمیں پورا یقین ہے کہ اسلام کے نام پر لیے ہوئے ملک میں اسلام کا بول بالا ہوگا اور یہ ملک سوشلزم اور کمیونزم کی لعنت سے پاک ہوگا شاید بلوچ صاحب کو پتہ نہیں کہ یہ تقریر انکی جماعت کے لئے آئندہ کالج الیکشن میں نقصان دہ ثابت ہوگی کیونکہ سندھ کے طلباء نے اپنی منزل سوشلزم کو بنا لیا ہے سندھ کے طلباء یہ بھی جانتے ہیں کہ نام نہاد اسلامی طلبہ جمعیت کا سندھ میڈیکل کالج اور کراچی یونیورسٹی میں اس کا کردار ہمیشہ طلباء دشمن رہا ہے اور یہ واحد طلبہ تنظیم ہے جس نے ہر دور میں عوام دشمن کردار کو بخوبی نبھایا ہے۔

ایک طالب علم۔ لاڑکانہ

تربت کے ڈاکٹر کا رویہ

مکران ڈویژن کے ہیڈ کوارٹر تربت کے اسپتال میں ایک ڈاکٹر عوام کے علاج معالجے کے لیے مقرر کیا گیا ہے مگر دیکھنے میں یہ آرہا ہے کہ وہ صرف مخصوص چند لوگوں کا علاج کرتا ہے اور عام لوگوں کو نظر انداز کرتا ہے ایک دن میں اسپتال میں بیٹھا تھا کہ ایک عورت اپنی گود میں ایک بچہ لیے ہوئے آئی اور ڈاکٹر سے کہا کہ میرے بیٹے کا پیشاب بند ہے اور اسے اسپتال میں داخل ہوئے چار دن ہو چکے ہیں۔ مگر آپ نے ابھی تک میرے بیٹے کو نہیں دیکھا ہے۔ اس کا بیٹا بہت رو رہا تھا اس عورت نے فریاد کی کہ خدارا میرے بیٹے کو دیکھیں اور علاج کریں مگر ڈاکٹر صاحب نے غصے سے کہا کہ جاؤ دفع ہو جاؤ۔ میں ایسے لوگوں کا علاج نہیں کر سکتا جو میری فیس ادا نہیں کر سکتے کیا ایک ڈاکٹر کے اس رویے کو مستحسن قرار دیا جا سکتا ہے۔

عبدالرسول محمد۔ مکران۔

ڈاکٹر مبشر کا تجزیہ

عرصہ دراز سے آپ کے پرچے کا مطالعہ کر رہا ہوں اور آپ پاکستان کے پسے ہوئے طبقوں کی جس طرح خلوص سے خدمت کر رہے ہیں خدا اس کا اجر آپ کو ضرور دے گا۔

آپ کے تازہ شمارہ میں (۲۴ فروری تا ۲ مارچ) میں ڈاکٹر مبشر حسن صاحب کا اس قدر فکر انگیز مقالہ شائع کرنے پر آپ کا بہت مشکور ہوں۔ اور ڈاکٹر صاحب کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں کہ ایک انجینئر ہونے کے باوجود ملک کے معاشرتی ڈھانچے پر ان کی باریک بینی ایک بہترین ایکسرے رپورٹ کی طرح ہے ویسے بھی خاکسار اپنے تئیں بھی انہی خطوط پر سوچتا ہے لہذا بے اختیار مضمون پڑھنے کے بعد آپ سے آدھی ملاقات کر رہا ہوں ہمارا ہدیہ تبریک ڈاکٹر صاحب تک ضرور پہنچا دیجیے۔

امجد جاوید ہاشمی نواب شاہ

بیوہ کی اپیل

آپ کے جریدے کی وساطت سے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق کے سامنے میں چند گذارشات پیش کرنا چاہتی ہوں کہ میں ایک بیوہ بے کس اور بے سہارا خاتون ہوں اور بہت ضعیف العمر ہوں میں مکان B/602 ملیر کالونی کراچی نمبر 37 کی لیز ہولڈر ہوں۔ میرا سابقہ داماد عاشق حسین جو مکان نمبر B/603 ملیر کالونی 37 کا الاٹی ہے میری بیٹی کے فوت ہو جانے کے بعد میرے مکان پر ناجائز طریقہ سے قبضہ کر رکھا ہے کیونکہ میرا کوئی بیٹا وغیرہ نہیں ہے اور بیوہ ہوں اس لیے اس کے خلاف کوئی کارروائی آج تک نہ کر سکی۔

اس درخواست سے قبل بھی کئی درخواستیں گزشتہ حکومت کو دے چکی ہوں لیکن کسی نے مجھ بیوہ کا ساتھ نہ دیا۔ آپ کو بھی کئی درخواستیں روانہ کی ہیں اور کئی مرتبہ پولیس آفیسر محلہ سے انکوائری کر چکے ہیں اور میں نے ایک درخواست مارشل لاء کورٹ میں بھی دی تھی جہاں پر سمری کورٹ اے کے سربراہ کرنل سرزمان خان نے ۱۳ دن کے اندر اندر میرے داماد کی بیوی سے مکان خالی کرنے کا حکم دیا تھا۔ لیکن میرے پاس ایک نوٹس آیا جس میں لکھا تھا کہ ۱۵ جنوری ۷۸ء کو مکان خالی ہو جائے گا لیکن آج تک مکان خالی نہیں ہو سکا ہے۔

جنرل صاحب آپ نے ہر پاکستانی کی جان اور مال کی حفاظت کا حلف اٹھایا ہے کیا آج مجھ غریب بیوہ پر یہ احسان کرو گے کہ جس کا حق ہو اس کو دلوایا جائے۔ میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ میرا مقدمہ کسی بھی فوجی کورٹ یا کسی خاص ٹریبونل میں پہنچایا جائے تاکہ میں اپنی صفائی میں کچھ پیش کر سکوں اور آپ کی عدالت سے جو فیصلہ ہوگا مجھے قابل قبول ہوگا اور اگر واقعی میں اس کی اصل مالک ہوں تو میرے مکان کا قبضہ فوراً مجھے دلوایا جائے۔ میری زندگی کی آخری خواہش ہے کہ اپنے مکان کو اپنی زندگی میں حاصل کر لوں اور میرے سابقہ داماد کو میرے ساتھ ۴۲۰ کے الزام میں فوجی عدالت سے سزائیں دی جائیں۔ تاکہ آئندہ کوئی شخص کسی کی جان اور مال کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھ سکے

بنیادی بیگم لیز ہولڈر B/602 ملیر کالونی کراچی نمبر 37۔ حال مقیم B/607 ملیر کالونی کراچی نمبر 37

ترنم کے بعد اب تبسم

لوگ ابھی ترنم کے اغواء اور قتل کے سنگین واقعے کو بھولے بھی نہ تھے کہ تبسم اغواء کر لی گئی واقعہ کے مطابق محمد انور جو کہ تالپور پٹرول پمپ ٹنڈو محمد خان پر سیلزمین ہے اس کی چار سالہ لڑکی تبسم ۱۹ فروری کو ۱/۲ ۲ بجے دن اپنے گھر واقع پاکستان چوک سے باہر نکلی اور اس کے بعد اب تک گھر واپس نہیں لوٹی۔ یاد رہے کہ پاکستان چوک شہر کے عین وسط میں واقع ہے۔ محمد انور نے فوراً پولیس میں رپورٹ لکھوائی۔ تقریباً ۱۵۰ افراد نے شہر کا کونا کونا چھان مارا۔ مساجد، ریڈیو اور ٹھیلوں کے ذریعے گشتی اعلانات کرائے گئے مگر تبسم کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ تبسم کی گمشدگی سے سارے شہر میں سخت خوف و ہراس پھیل گیا ہے لوگ اپنے بچوں کو گھروں سے باہر نہیں نکال رہے ہیں۔ تقریباً ساٹھ ستر آدمیوں نے دو دن تک شہر سے باہر جانے والے تمام راستوں کی سخت نگرانی کی مگر لاحاصل ہمیشہ کی طرح پولیس نے اب بھی سرد مہری کا مظاہرہ کیا جب لوگوں نے پولیس انسپکٹر سے شکایت کی کہ آپ لوگ کچھ نہیں کر رہے ہیں۔ تو موصوف نے فرمایا۔ ہمارے پاس جادو کا چراغ تھوڑی ہے اگر قسمت میں ہوگی تو مل جائے گی۔ کوشش کر رہے ہیں" پولیس کے دو ٹوک جواب کے باوجود لوگوں نے اپنی کوششیں جاری رکھی ہیں اور ٹنڈو محمد خان کے آس پاس کے تمام دیہاتوں کو چھان مارا ہے مگر تبسم کا کوئی پتہ نہیں۔

اس واقعہ کا خاص پہلو یہ ہے کہ انور ایک غیر سیاسی آدمی ہے اور نہ اس کی کسی سے کوئی دشمنی ہے اور نہ ہی اغواء کرنے والوں نے اس سے کسی قسم کا رابطہ قائم کیا ہے ایک اور خاص بات یہ ہے کہ بھاگ دوڑ ... کوششوں کے باوجود اس اغواء کے متعلق معمولی سا بھی سراغ نہیں ملا ہے کہ چار سالہ تبسم کو کون کہاں اور کیوں لے گیا ہے۔ تبسم کے والدین، نانا نانی اور عزیزوں کی حالت ناقابل بیان ہے شہر کے تمام حلقوں میں اس واقعہ پر سخت رنج و غم اور غصہ پایا جاتا ہے۔

امیر الدین قریشی۔ ٹنڈو محمد خان۔

امامت کا دعویدار

کرناٹک کے صوبائی انتخاب میں سرکاری کانگریس پارٹی کی ہزیمت کے اعلان کے ساتھ ہی صدر کانگریس برہما نند ریڈی نے استعفا دیدیا ہے کہ ان کی جگہ بہتر آدمی کا انتخاب ممکن ہو۔ اور پارٹی کو اہل صدر مل سکے ہمارے ملک میں بعض سیاسی جماعتیں روز اول سے الیکشن میں ہار رہی ہے۔ لیکن ان کے لیڈر اپنی جماعتوں کو اپنی موروثی جاگیر سمجھتے ہیں اور جونک کی طرح چمٹے ہوئے ہیں بھارت میں ٹرین کے ایک حادثہ کے بعد آنجہانی لال بہادر شاستری نے جو اس وقت مواصلات کے وزیر تھے مرکزی کابینہ سے علیحدگی اختیار کر لی تھی ہمارے ہاں ترنم کیس ہو، فرقہ وارانہ فساد ہو، سودھرے کی لرزہ خیز داستان ہو، لانڈھی میں بس اور ریل کار کا حادثہ اور جانی نقصان ہو کوئی اپنی جگہ سے نہیں ٹلتا۔ ٹس سے مس نہیں ہوتا مکمل تحقیقات کے تہیہ کا اظہار اور عبرتناک سزا کا مژدہ سنا دیتا ہے اس نااہلی اور منافقت کے باوجود اس یقین کا اظہار بھی کرتا ہے کہ ع

لیا جائے گا ہم سے کام دنیا کی امامت کا۔

انسان بھی کیا خوب لطیفہ ہے، آہ زندانی

نزدیک دو دور دیرد زود

(مسز ثریا بلگرامی کراچی۔)

پنجاب نمبرداری مکاؤ تحریک

الفتح ۲۴ فروری (۳ مارچ ۷۸ء) "پنجاب نمبرداری مکاؤ تحریک" کے صدر محمد سلطان نے نمبرداری نظام کو جاگیرداری اور زمینداری نظام کے مماثل قرار دیکر غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن خود ان کے اپنے الفاظ ان کے دعوی کی تردید کرتے ہیں ان کے انٹرویو سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ نمبردار ملک کی دولت لوٹ کر کھا رہے ہیں اگر اس رقم کو ان سے محفوظ کر لیا جائے تو ملک ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو جائے گا۔ انہوں نے جو اعداد و شمار پیش کیے ہیں ان کے مطابق پنجاب کے چوبیس ہزار دیہاتوں کے نمبردار سالانہ چار کروڑ روپے کی رقم ہضم کر جاتے ہیں اگر چار کروڑ روپے کی رقم ان نمبرداروں میں تقسیم کی جائے تو فی کس تقریباً ۸۰ روپے ماہانہ بیٹھتی ہے تو کیا اسی

(باقی صفحہ ۳۹ پر)

ایڈیٹر
وہاب صدیقی

ایسوسی ایٹ ایڈیٹر
واحد بشیر

کالم نگار
حسین نقی
شبیہہ الحسن

سچ جھوٹ
اُم جلیل
طنز و مزاح
ابو ضیا اقبال

اسلام آباد
حمید شیراز

صوبائی نمائندے
احسان عظیم
سندھ مقیم حیدرآباد
کاشف
پنجاب مقیم لاہور
شہزاد غزنوی
سرحد مقیم پشاور
ناصر عرفات
بلوچستان مقیم کوئٹہ

انتظامی امور
وقیع احمد صدیقی

آرٹسٹ
سعید الدین

خاص مضامین

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ الفتح
کراچی

۱۰ تا ۱۶ مارچ ۱۹۷۸	جلد : ۸ شمارہ : ۴۴	ٹیلیفون ۴۳۲۲۷۴	قیمت ۲ روپے ۵۰ پیسے

ضلعی نمائندے

○ ناصر خان، میرپور خاص ○ ایاز سندھی، سانگھڑ ○ ابراہیم عباسی، خیرپور، سکھر، جیکب آباد، لاڑکانہ
○ کامل سموں، ٹنڈو الہ یار ○ ناصر زیدی، ملتان ○ فاروق طارق، شیخ شوکت علی، فیصل آباد، گوجرانوالہ ○ محمد افضل جنجوعہ
○ قاضی غیاث الدین جانباز شیخوپورہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ ○ سلیمان شیرف، گوادر ○ روشن ملک میانوالی ○ سید نذیر گیلانی آزاد کشمیر

غیر ممالک

■ پیکنگ، رشید بٹ ■ ماسکو، محمد زاہد ■ کینیڈا، سید ابن سعود ■ لندن، عبدالحفیظ قریشی
■ متحدہ عرب امارات مقیم دبئی، غلام جیلانی

ارشاد راؤ پبلشر نے ناظر پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر دفتر
ہفت روزہ الفتح ۶۹-۵ ڈی زرعی کرشل ایریا۔ پی، ای، سی، ایچ، ایس کراچی ۲۹ سے شائع کیا

کیا چاہتے ہو!!!

ہماری صحافت میں چند اخبارات و جرائد ایسے بھی ہیں جو اپنے منفی طرزِ فکر اور رجعت پسندانہ نکتۂ نگاہ کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی تحریروں پر تبصرہ کرنا یا انہیں زیرِ بحث لانا ہم نے اس لیے کبھی مناسب خیال نہیں کیا کہ قارئین ان کی فکری حدود و قیود سے واقف ہیں اور یہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کے افکار و اظہار کو کیا وقعت اور اہمیت دی جائے لیکن آج ہم اپنے اس اصول سے انحراف کرنے پر اس لیے مجبور ہوتے ہیں کہ اس قبیلے کے ایک ہفت روزہ نے انتہائی خطرناک رُخ اختیار کیا ہے۔ ایسا رُخ جو ہر محبِ وطن فرد کے لیے تشویش کا باعث ہے۔

ہمارے سامنے لاہور کے ہفت روزہ "زندگی" کا شمارہ بابت ۳ تا ۱۰ مارچ ۱۹۷۸ء ہے جس کا سرِ ورق ہمارے نکتۂ نگاہ سے انتہائی اشتعال خیز اور علاقائی منافرت انگیز ہے۔ ہماری اطلاعات کے مطابق حالہ میں وہ کچھ نہیں ہوا جس کی اطلاع اندرونی صفحات پر فراہم کی گئی ہے۔ نہ اس کا پس منظر وہ ہے جو اس جریدے نے پیش کیا ہے۔ ہالہ میں اب تک جو کچھ ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے اس کی پوری اطلاعات کہیں بھی شائع نہیں ہوئیں اور نہ ہی ہم اس موقف میں ہیں کہ اسے من و عن شائع کر سکیں۔ اس میں قانونی دشواریاں حائل ہیں۔ ایک بات جو ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں وہ یہ کہ اس علاقے کے امن داماں میں بڑے پیمانے پر خلل پڑا ہے اور کافی جسمانی اور مالی نقصان ہوا ہے اور یہ نقصان کسی ایک زبان کے بولنے والوں تک محدود نہیں ہے — نہ ہی اس علاقے میں یا کسی اور جگہ سیاسی تقسیم لسّانی بنیادوں پر ہے — معاصر مذکورہ نے اپنے ادارتی تبصرے میں اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ ایک جماعت (پیپلز پارٹی) پر پابندی عائد ہونی چاہیئے۔ اور اس کی مخالف جماعتوں کو نہ صرف کھل کر کام کرنے کی آزادی ملنی چاہیئے۔ بلکہ ان کی حمایت اور مدد بھی ہونی چاہیئے۔ اس خواہش کو سامنے رکھتے ہوئے اگر مذکورہ سرِورق اور اطلاعات پر نظر ڈالی جائے تو یہ مقصد واضح طور پر سامنے آتا ہے کہ پنجاب میں پیپلز پارٹی کی حمایت کو گھٹانا اور اس کی صفوں میں لسّانی بنیادوں پر اختلافات پیدا کرنا ہے۔ یہ مقصد بذاتِ خود اچھا ہے یا برا اس کا فیصلہ تو عوام خود کریں گے۔ ہم یہاں صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ معاصر مذکورہ اس مقصد کے حصول کے لیے جس تباہی کو دعوت دے رہا ہے اور جس خطرناک راہ کو اپنا رہا ہے وہ انتہائی خطرناک مضمرات کی حامل ہے۔ اس سے صرف ان طاقتوں کو، ملکی اور غیر ملکی دونوں کو، فائدہ پہنچ سکتا ہے جو موجودہ پاکستان کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتی ہیں۔

ہم اپنے اس یقین کا اظہار کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ معاصر مذکور اور وہ حلقہ جس کی معاصر مذکور نمائندگی کرتا ہے اپنی ہزار کوششوں کے باوجود بھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ عوام ایسے ہر مذموم منصوبے کو ناکام بنانے کا شعور اور طاقت رکھتے ہیں۔

اُن لوگوں کے بارے میں

جو اُمت کے فیصلے چکانے کے لئے مسندِ قضا پر بیٹھ جاتے ہیں

حالانکہ وہ اس کے اہل نہیں ہوتے

تمام لوگوں میں سب سے زیادہ خدا کے نزدیک مبغوض دو شخص ہیں۔ ایک وہ جسے اللہ نے اُس کے نفس کے حوالے کر دیا ہو (یعنی اُس کی بداعمالیوں کی وجہ سے اپنی توفیق سلب کر لی) جس کے بعد وہ سیدھی راہ سے ہٹا ہوا بدعت کی باتوں پر فریفتہ اور گمراہی کی تبلیغ پر مٹا ہوا ہے۔ وہ اپنے ہوا خواہوں کے لئے فتنہ اور سابقہ لوگوں کی ہدایت سے برگشتہ ہے۔ وہ تمام ان لوگوں کے لئے جو اس کی زندگی میں یا اس کی موت کے بعد اس کی پیروی کریں، گمراہ کرنے والا ہے۔ وہ دوسروں کے گناہوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے اور خود اپنی خطاؤں میں جکڑا ہوا ہے۔ اور دوسرا شخص وہ ہے جس نے جہالت کی باتوں کو (ادھر اُدھر سے) بٹور لیا ہے۔ وہ اُمت کے جاہل افراد میں دوڑ دھوپ کیا کرتا ہے اور فتنوں کی تاریکیوں میں غافل و مدہوش پڑا رہتا ہے۔ اور امن و آشتی کے فائدوں سے آنکھ بند کر لیتا ہے۔ چند انسانی شکل و صورت سے ملتے جلتے ہوئے لوگوں نے اُسے عالم کا لقب دے رکھا ہے۔ حالانکہ وہ عالم نہیں۔ وہ ایسی (بے سود) باتوں کے سمیٹنے کے لئے منہ اندھیرے نکل پڑتا ہے جن کا نہ ہونا ہونے سے بہتر ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ گندے پانی سے سیراب ہو لیتا ہے اور لایعنی باتوں کو جمع کر لیتا ہے تو لوگوں میں قاضی بن کر بیٹھ جاتا ہے اور دوسروں پر مشتبہ رہنے والے مسائل کے حل کرنے کا ذمہ لیتا ہے۔ اگر کوئی اُلجھا ہوا مسئلہ اُس کے سامنے پیش ہوتا ہے تو اپنی رائے سے اُس کے لئے بھرتی کی فرسودہ دلیلیں مہیا کر لیتا ہے اور پھر اس پر یقین بھی کر لیتا ہے۔ اس طرح وہ شبہات کے اُلجھاؤ میں پھنسا ہوا ہے جس طرح مکڑی خود ہی اپنے جالے کے اندر۔ وہ خود یہ نہیں جانتا کہ اُس نے صحیح حکم دیا ہے یا غلط۔ اگر صحیح بات بھی کہی ہو تو اسے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں غلط نہ ہو اور غلط جواب ہو تو اسے توقع رہتی ہے کہ شاید یہی صحیح ہو۔ وہ جہالتوں میں بھٹکنے والا جاہل اور اپنی نظر کے دھندلاپن کے ساتھ تاریکیوں میں بھٹکنے والی سواریوں پر سوار ہے۔ نہ اس نے حقیقتِ علم کو پرکھا ہے۔ نہ اس کی تہہ تک پہنچا۔ وہ روایات کو اس طرح درہم برہم کرتا ہے جس طرح سُوکھے ہوتے تنکوں کو۔

خدا کی قسم وہ ان مسائل کے حل کرنے کا اہل نہیں جو اس سے پوچھے جاتے ہیں اور نہ اس منصب کے قابل ہے جو اُسے سپرد کیا گیا ہے۔ جس چیز کو وہ نہیں جانتا اس چیز کو وہ کوئی قابلِ اعتنا علم ہی نہیں قرار دیتا۔ اور جہاں تک وہ پہنچ سکتا ہے۔ اس کے آگے یہ سمجھتا ہی نہیں کہ کوئی دوسرا پہنچ سکتا ہے اور جو بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی اُسے پی جاتا ہے کیوں کہ وہ اپنی جہالت کو خود جانتا ہے۔

(ناحق بہائے ہوئے) خون اس کے ناروا فیصلوں کی وجہ سے چیخ رہے ہیں۔ اور غیر مستحق افراد کو پہنچی ہوئی میراثیں چلا رہی ہیں۔ اللہ ہی سے شکوہ ہے ان لوگوں کا جو جہالت میں جیتے ہیں اور گمراہی میں مر جاتے ہیں۔ ان میں قرآن سے زیادہ کوئی بے قیمت چیز نہیں۔ جب کہ اسے اس طرح پیش کیا جائے، جیسا پیش کرنے کا حق ہے۔ اور اس قرآن سے زیادہ ان میں کوئی مقبول اور قیمتی چیز نہیں۔ اس وقت جب کہ اس کی آیتوں کا بے محل استعمال کیا جاتے۔ ان کے نزدیک نیکی سے زیادہ کوئی بُرائی اور برائی سے زیادہ کوئی نیکی نہیں

سیاسی سرگرمیوں پر پابندی ہے۔ یہ پابندی ۳۱ مارچ ۱۹۷۸ء تک ہے لیکن کون جانے، مقررہ تاریخ کو پابندی ختم ہوتی ہے یا "نظریہ ضرورت" کام آتا ہے۔ یہ نظریہ بڑے ہی کام کی چیز ہے۔ نسخہ کیمیا ہے۔ ہر مرض کی دوا ہے۔ ہر جگہ اور ہر موقع پر فٹ ہو جاتا ہے۔ خیر چھوڑیئے اس نظریے کے تذکرے کو۔ بات تھی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی کی، پابندی کا یا "قاعدہ" "جواز" پیش کیا گیا۔ "جابر حاکم کے سامنے کلمہ حق پڑھنے والے اخبار" "جواز" سے مطمئن ہیں۔ لیکن عوام مطمئن نہیں۔ وہ تو بی بی سی سنتے ہیں۔ ۵ جولائی سے قبل بھی سنتے تھے۔ اور اب بھی کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ پاکستان کے حکمران طبقات کے نزدیک آزادی صحافت ہر جانے والے کو گالیاں اور ہر آنے والے کو سلام کرنا ہے۔ عوام بی بی سی پر اعتماد کرتے ہیں اور بی بی سی کہہ رہا ہے کہ "مسٹر بھٹو کے خلاف قتل کے مقدمے کی سماعت مکمل ہو گئی ہے اور فیصلہ محفوظ کر لیا گیا ہے۔ ایک ماہ کے لیے سیاسی سرگرمیوں پر پابندی کا جو فیصلہ کیا گیا ہے اس کی اصل وجہ بھی یہی ہے۔"

سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگانے سے سب سے زیادہ قومی اتحاد والے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ دوروں کے دوران "وی آئی پی سلوک" ان سے کیا جاتا تھا اور ان کی کار کے آگے پولیس کی جیپ چلتی تھی، چنانچہ حکومت میں نہ ہوتے ہوئے بھی انہیں حکومت کا نشہ اتنا ہو گیا تھا کہ وہ عبوری دور کی "بقائے دوام" کے لیے دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے تھے۔ لیکن پابندی کے سبب نشہ ہرن ہو گیا ہے اور وہ "آرام" فرما رہے ہیں۔ اور اس آرام کے لیے بھی دعا گو ہیں۔

رہی پیپلز پارٹی، تو جب پابندی نہیں تھی تب بھی وہ پابندی سے آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔ کبھی بیگم نصرت بھٹو گھر میں نظر بند کی جاتی تھیں اور کبھی ازراہ عنایت گھومنے پھرنے کی اجازت مل جاتی تھی۔ بے نظیر بھٹو کو بھی کبھی ہاؤس اریسٹ کیا جاتا تھا اور کبھی کراچی سے لاہور بھیج دیا جاتا تھا۔ اور ہمارے دوست طاہر محمد خان تو اب صوبہ بدری کے ایام لاہور میں گزر رہے ہیں۔ اور قدرت ان پر اتنی مہربان ہوئی کہ لاہور میں برف باری ہوئی اور وہ لاہور میں کوئٹہ کے مزے لوٹنے لگے۔ ان دنوں بیگم نصرت بھٹو اور بے نظیر بھٹو سیاست پر باتیں نہیں کرتیں کیونکہ سیاست شجر ممنوعہ ہے البتہ "چائے کی پیالی پر" پیپلز پارٹی کے رہنماؤں اور کارکنوں سے "موسم" کے موضوع پر گفتگو کرتی ہیں۔ اور تو اور تحریک استقلال کے اصغر خان بھی "چائے کی پیالی" میں مصروف ہیں۔

قارئین کرام! سیاسی سرگرمیوں پر پابندی ہے۔ لیکن ۴ مارچ کو وفاقی دار الحکومت میں سیاست دانوں کا اجتماع ہوا میزبان چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھے۔ اور مشیر کار مولانا

لاہور ہائیکورٹ کے ایک فل بنچ کے روبرو نواب محمد احمد خان کے قتل کے مقدمے کے سلسلے میں وکیل استغاثہ اعجاز حسین بٹالوی کے دلائل ۲ مارچ ۱۹۷۸ء کو مکمل ہو گئے۔ اس طرح مقدمہ

پیپلز پارٹی پہلے کہاں آزاد تھی جو پابندی سے متاثر ہوگی

مفتی محمود، پروفیسر غفور، پیر پگارا، شیر باز مزاری، ولی خان، بیگم نسیم ولی خان، نوابزادہ نصر اللہ خان، میاں طفیل، چوہدری ظہور الہٰی، خان قیوم، اشرف خان، مولانا عبدالستار نیازی اور نبی بخش زہری وغیرہم۔ دعوت نامے سردار عطا اللہ مینگل، نواب خیر بخش مری، میر غوث بخش بزنجو، اصغر خان اور پیپلز پارٹی کے غلام مصطفےٰ جتوئی، صاحبزادہ فاروق علی خان، میر افضل خان اور کوثر نیازی کو بھی بھیجے گئے تھے لیکن جناب مینگل مری اور بزنجو بریفنگ میں شامل نہیں ہوئے۔ تحریک استقلال نے فروری کی بریفنگ میں اپنا مبصر مشیر احمد پیش امام بھیجا تھا لیکن اس مرتبہ تحریک نے مکمل بائیکاٹ کیا۔ پیپلز پارٹی نے بھی حسب سابق بائیکاٹ کیا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ مولانا کوثر نیازی کو ۲۸ فروری کو پیپلز پارٹی سے نکالا جا چکا ہے لیکن انہیں بریفنگ میں پیپلز پارٹی کے سیکرٹری اطلاعات کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ پارٹی سے مولانا کے اخراج کی اطلاع حکام کو نہ ملی ہو۔

سیاست دانوں کا یہ اجتماع گیس اور تیل کے بارے میں "بریف" کرنے کے لیے بلایا گیا تھا لیکن سیاست دانوں نے درخواست کی کہ سیاست پر بھی بریفنگ دی جائے۔ چنانچہ پابندی کے دور میں بھی ازراہ عنایت استدعا قبول کر لی گئی۔ اور ایک خصوصی اجلاس میں سیاست پر گفت و شنید ہوتی۔

نواب مری، سردار مینگل اور میر بزنجو کا سبی میں جنرل ضیا سے ملاقات کرنا، لیکن بریفنگ میں شریک نہ ہونا اس بات کی علامت ہے کہ بلوچستان میں صورتحال معمول پر نہیں آئی۔ اس قسم کی اطلاعات بھی مل رہی ہیں کہ عام معافی کے اعلان کے بعد کالعدم نیپ اور سرحد اور بلوچستان کے جو لوگ افغانستان میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے ان میں سے صرف پشتون واپس آ رہے ہیں۔ بلوچ نہیں۔

قارئین کرام! افغانستان کے صدر سردار داؤد اسلام آباد پہنچ چکے ہیں۔ ان کے اعزاز میں صدر پاکستان نے جو ضیافت دی اس میں پی این اے کے سیاست دانوں کے علاوہ بلوچستان کے تین بڑے بلوچ رہنما "میر بزنجو، سردار مینگل، نواب مری" پیپلز پارٹی کے میر افضل خان، پیپلز پارٹی سے خارج شدہ مولانا کوثر نیازی اور تحریک استقلال کے مشیر احمد پیش امام نے بھی شرکت کی۔ ■

کی کارروائی بھی مکمل ہو گئی۔ عدالت نے اپنا فیصلہ محفوظ رکھا ہے پی پی آئی کے مطابق توقع ہے کہ فیصلے کا اعلان دس روز تک کر دیا جائے گا۔ تاہم فیصلے کی تاریخ کا اعلان چیف جسٹس کریں گے۔ مقدمہ کی سماعت کرنے والا فل بنچ چیف جسٹس مشتاق حسین، مسٹر جسٹس ذکی الدین پال، مسٹر جسٹس ایم ایس ایچ قریشی مسٹر جسٹس آفتاب حسین اور مسٹر جسٹس گلباز خان پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو، سابق فیڈرل سیکورٹی فورس کے ڈائریکٹر میاں محمد عباس اور تین جونیئر افسر غلام مصطفےٰ، ارشد اقبال اور رانا افتخار احمد ملوث تھے۔ ان پر الزام ہے کہ انہوں نے سابق رکن قومی اسمبلی احمد رضا قصوری کو قتل کرنے کی سازش کی اور دس اور گیارہ نومبر ۱۹۷۴ء کی درمیانی شب کو لاہور میں ان پر حملہ کیا گیا۔ جس میں احمد رضا قصوری خود تو بچ گئے لیکن ان کے والد نواب محمد احمد خان شدید زخمی ہوئے اور بعد میں چل بسے۔

ہائیکورٹ نے مقدمہ کی سماعت گزشتہ سال ستمبر میں شروع کی تھی۔ استغاثہ کی طرف سے دو وعدہ معاف گواہوں مسعود محمود سابق ڈائریکٹر جنرل ایف ایس ایف اور غلام حسین سابق انسپکٹر ایف ایس ایف سمیت کل بیالیس گواہ پیش کیے گئے، صفائی میں صرف چار گواہ پیش کیے گئے۔ مقدمہ کی تمام کارروائی ٹیپ ریکارڈ پر محفوظ کی گئی۔ پہلے تمام کارروائی کھلی عدالت میں ہوئی۔ لیکن بعد میں عدالت نے حکم دیا کہ آئندہ کارروائی بند کمرے میں ہوگی۔ استغاثہ کی طرف سے ایم انور مرحوم، اعجاز حسین بٹالوی اور ایم اے رحمٰن خصوصی وکلاء کے طور پر پیش ہوئے جب تک بھٹو نے اپنے وکیلوں کا وکالت نامہ منسوخ نہیں کیا تھا۔ اس وقت تک ان کی طرف سے ڈی ایم اعوان، احسان قادر شاہ عنایت اللہ چیمہ، اور مس طلعت یعقوب وکلائے صفائی کے طور پر پیش ہوئے۔ ملزم میاں محمد عباس کی پیروی قربان صادق اکرام نے اور ملزم صوفی غلام مصطفےٰ، ارشد اقبال اور رانا افتخار کی پیروی ارشاد احمد قریشی نے کی۔

پاکستان کی معیشت کو تباہ کرنے کا خوفناک ہتھیار

بھارت پاکستان سے بہت وسیع پیمانے پر تجارت کرنا چاہتا ہے اور اپنی اس خواہش کا اظہار کھل کر اپنے ملک میں بھی کر چکا ہے اور بھارت کے وزیر خارجہ مسٹر اٹل بہاری باجپئی اپنے دورۂ پاکستان کے دوران پاکستان میں بھی کر چکے ہیں تجارت کوئی بری چیز نہیں ہے لیکن اس جدید دور میں جب کہ امریکہ جیسا ملک جاپان سے کھلی تجارت نہیں کرنا چاہتا پاکستان کے لئے بھی بھارت سے یک طرفہ ٹریفک کے طور پر تجارت کرنا ملک کو تباہ کرنے کے مترادف ہے۔ جاپان ایک ترقی پذیر ملک ہے اور امریکہ ترقی یافتہ ملک ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عالمی طاقت بھی ہے جب جاپان نے اپنی مصنوعات سے امریکی مارکیٹ کو فتح کرنا شروع کیا اور جاپان سے امریکہ جاکر امریکی مصنوعات کے مقابلے میں اپنی معیاری مصنوعات سستے داموں بیچنی شروع کیں تو امریکہ کے ماہرین اقتصادیات و تجارت چیخ اٹھے انہوں نے کہا کہ اگر یہ تجارت مساوی بنیادوں پر نہ ہوئی تو امریکہ کی اقتصادیات چند سال میں ہی جاپان کی محتاج ہو کر رہ جائے گی۔ امریکی ماہرین نے کہا جب تک جاپان امریکہ سے بھی کم از کم اتنی ہی مالیت کا مال درآمد نہ کرے جتنی مالیت کا مال جاپان امریکی منڈیوں میں لا رہا ہے۔ اس وقت تک تجارت کی اجازت نہ دی جائے۔ یہ حال تو ترقی پذیر اور انتہائی ترقی یافتہ ملک کی تجارت کا ہے۔ اس صورتحال میں اگر ہم پاکستان اور بھارت کی تجارت کو دیکھیں تو دونوں ملک ہی ترقی پذیر ہیں۔ البتہ بھارت صنعتی میدان میں پاکستان سے بہت آگے ہے پھر وہاں سے جو تجارت ہو رہی ہے اس پر حکومت اپنی جانب سے کچھ رقم بطور سبسڈی فراہم کرتی ہے اور جب یہ مصنوعات پاکستانی بازار میں پہنچتی ہیں تو انتہائی سستی ہونے کی وجہ سے ہر صارف کی توجہ اپنی جانب مبذول کرتی ہیں۔ بھارت اپنی مصنوعات سے پاکستانی منڈیوں کو بھر دینا چاہتا ہے کہ یہ اس کے مفاد میں ہے مگر اس کے جواب میں وہ ہماری مصنوعات کو کم از کم اس مقدار میں اپنے ملک میں درآمد نہیں کرتا۔ اسی وجہ سے ہماری ادائیگیوں کا توازن بگڑ کر رہ گیا ہے۔ پچھلے دو ماہ میں سرکاری طور پر جو اعداد و شمار دونوں ممالک کے درمیان تجارت کے جاری کئے گئے ان میں پاکستان سے باہر جانے والی مصنوعات لاکھوں روپوں میں اور بھارت سے آنے والی مصنوعات کئی کروڑ روپے کی ہیں اعداد و شمار میں کوئی توازن نہیں ہے۔ بھارت کی مصنوعات ابھی تک پاکستان کی منڈیوں میں گہرائی تک نہیں پہنچی ہیں۔ بھارت بے چین ہے کہ پاکستانی صارف تک اس کی مصنوعات کسی بھی طرح سے پہنچ جائیں۔ گذشتہ دنوں اسلام آباد میں بھارت کے سفیر کی رہائش گاہ پر ایک نمائش کا اہتمام کیا گیا۔ نمائش کیا خاصی بڑی مارکیٹ سجادی گئی تھی۔ سوئی سے لے کر سائیکل تک فروخت کے لئے موجود تھی۔ اس کے باوجود کہ مارکیٹ لگنے کا اعلان نہیں کیا گیا تھا خریداروں کا ہجوم تھا۔ شام تک تقریباً سبھی کچھ بک گیا۔ بھارتی سفارت خانے نے اعلان کیا کہ فروخت سے حاصل ہونے والی رقم اپوا کی امداد کے لئے صرف کی جائے گی۔ اپوا جیسا کہ نام سے ظاہر ہے آل پاکستان ویمن ایسوسی ایشن ہے۔ اس ایسوسی ایشن میں پاکستانی عوام کی نہیں خواص کی بیگمات ممبر ہیں۔ انہی خواص کی بیگمات اس مارکیٹ میں بھی موجود تھیں یہ خواص وہ ہیں جو بھارت کی مصنوعات کی ملک میں تجارت کی اجازت دینے کے ذمہ دار ہیں۔ حکومت پاکستان کو بھارت کی حکومت حکومت کی سطح پر بات چیت میں اس بات پر رضامند نہیں کر سکی کہ بھارت کو پاکستان میں اپنی مصنوعات پھیلانے کی اجازت دی جائے اب حکومت بھارت نے بیگمات کے محاذ کا سہارا لیا ہے۔ یہ سہارا واقعی بے حد مضبوط ہے اگر فیصلہ کرنے والے اصحاب کی بیگمات دن رات اس سفارش میں مصروف ہیں کہ یہ اجازت ملنی چاہیئے کہ ہمیں یقین ہے کہ متعلقہ اصحاب زیادہ روز تک "ہوم گورنمنٹ" کا یہ دباؤ برداشت نہیں کر سکیں گے۔ اعلیٰ طبقے کی بیگمات کو صرف اپنے مفادات عزیز ہیں، ان کی بلا سے ملک کی معیشت تباہ ہو، کارخانے بند ہوں، پاکستان بھارت کی منڈی بن کر رہ جائے یا کالونی بن جائے انہیں اس بات سے غرض ہے کہ انہوں نے جو قیمت امداد کی صورت میں وصول کر لی ہے اس کا احسان اتر جائے۔ یہ بیگمات ویسے بھی کون سی

(باقی صـ ۳۸ پر)

تعزیت

پاکستان پریس انٹرنیشنل لاہور کے بیورو منیجر اور "الفتح" کے کالم نویس جناب حسین نقی کے والد محترم جناب ایس ایم نقی گزشتہ دنوں لکھنؤ میں رحلت فرما گئے وہ کچھ عرصے سے علیل تھے اور ان کی عمر، سال تھی ان کی وفات کی اطلاع تار کے ذریعے ۵ مارچ ۱۹۷۸ء کو لاہور میں موصول ہوئی۔

ادارہ الفتح اس غم میں اُن کا برابر کا شریک ہے اور پسماندگان سے اظہار ہمدردی کرتا ہے۔

بلراج مدھوک کا بیان امریکی حکمت عملی کے عین مطابق ہے

وہاب صدیقی

امریکہ کو صرف اپنے مفادات عزیز ہیں

تیل کے لئے امریکہ ایشیائی عوام کا تیل نکال رہا ہے

گزشتہ ماہ کے اواخر میں کارٹر انتظامیہ کے وزیر دفاع ہارڈ براؤن نے بحرالکاہل اور جنوبی کوریا کا دورہ کیا۔ وہاں متعین امریکی فوجی کمانڈرز سے مذاکرات کئے۔ دورے سے واپسی کے بعد انہوں نے پیسفک اور نیشنل لاس اینجلز ورلڈ افیئرز کونسل سے خطاب کرتے ہوئے اپنے دورے کی تفصیلات بتائیں یورپ اور ایشیا کے بارے میں امریکی پالیسی کی وضاحت کی۔ ایشیا میں امریکہ کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا "ایشیا میں صورتِ حال ہمارے مفادات کے حق میں ماضی کے مقابلے میں زیادہ سازگار ہے۔ ہم اس امر کی ضمانت چاہتے ہیں کہ یہ فضا برقرار رہے۔ اسی لئے ہم زیادہ فوجی طاقت مغربی بحرالکاہل میں رکھتے ہیں ان میں بی۔۵۲، بیلسٹک میزائل آبدوزیں، امریکی فضائیہ کے شاطر لڑاکا اسکواڈرن، دو طیارہ بردار جہاز، دو ایمفی بیٹس تیار باش گروپ، بیس گروزر اور تباہ کن جہاز، دو تہائی میرین ڈویژن اور میرین کا فضائی ونگ شامل ہیں۔" وزیر دفاع نے کہا "صدر نے فیصلہ کیا ہے کہ امریکہ ایشیا میں اپنی لڑاکا فوج کی موجودہ تعداد برقرار رکھے گا۔ نہ ہی ہم اس امکان کو نظر انداز کر رہے ہیں کہ مغرب میں متعین افواج کو ہنگامی صورت میں ایشیا میں اتارا جا سکتا ہے۔ تاہم اس کی کوئی ضمانت نہیں کہ صورتِ حال اسی طرح برقرار رہے گی۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ اگر ہم ایشیا کو نظر انداز کریں۔ وہاں اپنی صلاحیت میں کمی کر دیں۔ اور اپنی توجہ کسی اور جگہ مرکوز کریں۔"

سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے مفادات ہیں۔ جن کے لئے کارٹر انتظامیہ اپنے ہاتھیوں کے ذریعے ایشیا کو رَوندڈالنے کا منصوبہ بنائے ہوئے ہے۔ ایشیا میں امریکہ کے کئی مفادات ہیں۔ بنیادی اور اہم مقصد ایشیا پر اپنی بالادستی قائم کرنا اور اپنی حریف برتر طاقت سوویت یونین کا اثر ورسوخ ایشیا سے زائل کرنا ہے۔ مسٹر براؤن ایشیا کی موجودہ صورتِ حال کو امریکی مفادات کے حق میں سازگار بتاتے ہیں۔ اور انہیں بتانا بھی چاہیئے۔ کیونکہ تھائی لینڈ میں فوجی انقلاب، سری لنکا اور بھارت میں "ہل" کی فتح، سعودی عربیہ میں امریکی یہودیوں کے داخلے کی اجازت، صدر سادات کا دورۂ اسرائیل، مصری اور اسرائیلی حکام کے مابین مذاکرات، پاکستان میں بھٹو حکومت کا زوال، اور پھر بھارتی وزیر خارجہ کا دورۂ پاکستان، امریکی پالیسی کی بالادستی کی علامات ہیں۔ اور ایشیا میں امریکی مفادات کے حق میں "فضا سازگار" ہونے کا ثبوت ہیں۔ لیکن امریکہ اس صورت حال سے بھی مطمئن نہیں۔ مسٹر براؤن کہتے ہیں "توازن لازماً مستقل نہیں ہے۔ ایشیا اور بحرالکاہل میں سوویت فوجی طاقت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ چینی روسی تعلقات میں حربی اہمیت کی حامل بنیادی تبدیلیاں ممکن ہیں۔ کوریا ہمیشہ ایک غیر یقینی عنصر رہا ہے جو امن میں خلل ڈال سکتا ہے۔ اور بڑی طاقتوں میں نفاق پیدا کر سکتا ہے۔ ویت نام اپنے غیر کمیونسٹ ہمسایوں کے خلاف ایک مہم پسندانہ پالیسی اختیار کر سکتا ہے۔"

دوسرا امریکی اہم مفاد عرب ممالک خصوصاً خلیج کے تیل کی سپلائی کو برقرار رکھنا ہے۔ امریکہ تیل کی اپنی نصف ضروریات اس علاقے سے پوری کرتا ہے۔ چنانچہ گزشتہ ستمبر میں ہی کارٹر نے ہدایات جاری کی تھیں کہ خلیج فارس کے دفاع کو امریکی جنگی حکمت عملی کی ترجیحات کی فہرست میں رکھا جائے تاکہ وہ تیل کی سپلائی برقرار رکھنے کے لئے سوویت یونین کے ممکنہ حملے یا مشرق وسطیٰ کی دیگر انقلابی تحریکوں کی طرف سے کسی کارروائی کے پیش نظر اُسے اپنی تحویل میں لے سکے۔ ۲۴ فروری ۱۹۷۸ء کو مسٹر براؤن نے بیروت میں اس مسئلے پر تبصرہ کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ "امریکہ تیل کی پیداوار اور سپلائی لائن کو دشمن سے محفوظ رکھنے کا پختہ ارادہ رکھتا ہے۔ اور ضرورت پڑنے پر خلیج فارس کے تیل پیدا کرنے والے عرب ممالک میں فوری مداخلت کے لئے خصوصی فوج بھی تشکیل دی گئی ہے۔"

یہ تو ہے وہ کردار، جو خود امریکہ ایشیا میں ادا کر رہا ہے۔ اور ادا کرنے والا ہے۔ لیکن اب امریکہ نے "ڈلس حکمت عملی (جس کے تحت عالمی انقلابی تحریکات کو کچلنا تنہا امریکہ کی ہی ذمّہ داری قرار دی گئی تھی) ترک کر چکا ہے۔ ۱۹۶۸ء میں امریکہ کے سابق وزیر خارجہ ڈاکٹر ہنری کسینگر نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا "دنیا میں بڑی طاقتوں کی مطلق العنانی کے دن ختم ہو کر علاقائی طاقتوں کے مؤثر ہونے کے دن آیا چاہتے ہیں۔ امریکہ کے لئے ضروری ہوگا کہ باہمی تعاون کے علاقے وجود میں لائے جائیں۔ امریکہ کی مدد سے علاقائی طاقتوں کو اپنے گرد کی ذمّہ داری سونپی جائے۔ اپنے اپنے علاقے کی دیکھ بھال نامزد علاقائی طاقتیں خود کریں اور امریکہ کی ذمّہ داری عالمی ڈھانچے کو سنبھالا دینے کی ہو۔" صدر نکسن نے اپنے دورِ اقتدار میں کسینگر کے اس نظریہ کو عملی رُوپ دینے کی کوشش کی۔ "نکسن حکمت عملی" میں "ایشیائی علاقائی استحکام" کی تجویز پیش کی گئی جس میں

بھارت کو کلیدی حیثیت دی گئی۔ دوسری جانب بقول "نیوز ویک" واشنگٹن نے "تہران کے گھوڑے" پر شرط لگائی اور اُسے آگے بڑھایا۔ نیو لینڈ کے جریدے "نیو پراسپکٹس" (شمارہ ۳۰ ۱۹۷۷ء) کے مطابق پندرہ ملین ڈالر سے زائد مالیت کا اسلحہ امریکہ سے خرید چکا ہے۔ جس میں تین ٹنگ سب میرین اور چھ ڈی ڈی ۹۶۳۰ تباہ کن بھاری بحری جہاز شامل ہیں۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ فوجی ماہرین کے مطابق یہ آبدوزیں اور بحری جہاز خلیج میں استعمال نہیں ہو سکتے کیونکہ یہاں پانی کی گہرائی اتنی زیادہ نہیں۔ یہ بحرِ ہند میں ہی استعمال ہو سکتے ہیں۔ لیکن ایران نہ تو رقبہ کے اعتبار سے نہ ہی آبادی کے لحاظ سے اتنا بڑا ملک ہے کہ وہ پورے ایشیا کی قیادت سنبھال سکے۔ البتہ بھارت میں یہ صلاحیت موجود ہے۔

چنانچہ جب بھارت سوویت یونین کے آغوش میں چلا گیا تھا۔ تب بھی امریکہ نے بھارت کو نظر انداز نہیں کیا۔ کیونکہ ڈلس سے لے کر ہارڈ براؤن تک تمام امریکی وزرائے خارجہ بھارت کو نظر انداز نہ کرنے کا مشورہ دیتے رہے ہیں...

جمی کارٹر کے اسسٹنٹ سیکریٹری آف اسٹیٹ نے صاف طور پر کہہ دیا کہ بھارت کو جنوبی ایشیا کی قیادت سنبھال لینی چاہیئے لیکن پاکستان (جسے امریکہ اپنی خارجہ پالیسی کا "کارنر اسٹون" قرار دیتا ہے) کے عوام بھارت کی بالادستی قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ اور نہ اب ہیں۔ پیپلز پارٹی کے دورِ حکومت میں پاکستان اولیت مشرقِ وسطیٰ خصوصاً تیل پیدا کرنے والے ممالک کو دیتا تھا مسٹر بھٹو کی اس پالیسی کی متعدد وجوہ تھیں۔ بنیادی وجہ اقتصادی امداد اور قرضوں کی تھی۔ "پٹرول ڈالر" کے سبب عرب ممالک امریکہ کی نسبت پاکستان کو زیادہ فراخ دلی سے امداد دے سکتے تھے۔ علاوہ ازیں عرب ممالک سے تجارتی توازن ہمیشہ پاکستان کے حق میں رہتا۔ اور عرب ممالک میں کام کرنیوالے پاکستانی ۸۰ ملین ڈالر ماہانہ پاکستان بھیجتے ہیں ان اقتصادی اسباب کے تحت مشرقِ وسطیٰ کو فوقیت دی گئی۔ جنگِ رمضان میں عربوں کی ہر ممکن امداد کی گئی۔ پھر مسٹر بھٹو نے ایٹمی ری پروسیسنگ پلانٹ کے لیے فرانس سے معاہدہ کیا۔ یہ پلانٹ پُرامن مقاصد اور ایٹم بم کی تیاری میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ وائٹ ہاؤس کو عربوں خصوصاً لیبیا کے کرنل قذافی کی اس شدید خواہش کہ "ہمارے پاس ایٹم بم ہو" کا بخوبی علم تھا۔ پاکستان عرب تعلقات بھی اس کے پیش نظر تھے ان دونوں باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے امریکہ نے ایٹمی ری پروسیسنگ پلانٹ کی مخالفت کی تھی۔

بہرحال بات ہو رہی تھی بھارت کی بالادستی کی۔ آج کے دور میں ابتدا اقتصادیات سے ہی کی جاتی ہے اقتصادی بالادستی کا نتیجہ سیاسی بالادستی میں نکلتا ہے۔ ازمیر کانفرنس میں آر سی ڈی کی توسیع اور اس میں بھارت، افغانستان اور بنگلہ دیش کو شامل کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔ یہ تجویز تہران نے پیش کی تھی۔ پھر تہران کی جانب سے مشترکہ منڈی کا منصوبہ پیش کیا گیا۔ لیکن پاکستان نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ البتہ اس نظریہ کو واضح الفاظ میں مسترد نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ تجویز "برادر مسلم ملک" کی طرف سے پیش کی گئی تھی۔ بلکہ بقول ایک پاکستانی سیاسی مبصر "ہم دوٹوک الفاظ میں تجویز مسترد نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہمیں تہران سے قرضے، امداد، قرضوں کی ادائیگی کی معیاد میں توسیع کی درخواستیں بھی کرنی پڑتی ہیں۔" بھارتی وزیر خارجہ نے بھی دورہ پاکستان سے قبل مشترکہ منڈی کی تجویز پیش کرنا ضروری سمجھا۔ پھر وہ پاکستان آئے۔ بتایا جاتا ہے کہ اس مسئلے پر گفتگو ہوئی۔ گو پاکستان نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا۔ لیکن جس فراخدلی

ری پروسیسنگ پلانٹ کی مخالفت کیوں ؟

سے درآمدی لائسنس دیئے جا رہے ہیں اس سے پاکستانی معیشت پر منفی نتائج مرتب ہونے شروع ہو گئے ہیں خصوصاً ٹیکسٹائل انڈسٹری پر۔ اب بھلا یہ کونسی پالیسی ہے کہ پاکستان سوتی کپڑے کے معاملے میں نہ صرف خودکفیل ہے بلکہ پیداوار فاضل ہے۔ اس کے باوجود سوتی کپڑا بھارت سے درآمد کیا جا رہا ہے کہا جاتا ہے کہ جب پاکستان نے مذاکرات کے دوران مسئلہ کشمیر کا ذکر کیا تو بھارتی وزیر خارجہ نے کہا۔ "شاہی! اس مسئلے کو چھوڑو۔ اور بات کرو۔" تاہم انہوں نے "ازراہِ عنایت" پاکستان کی آزادی اور سالمیت کا یقین دلایا ہے۔

لیکن اس یقین دہانی کو ایک ہفتہ بھی نہیں گذرا تھا کہ سرینگر میں جن سنگھ پارٹی کے رہنما پروفیسر بلراج مدھوک نے کہا "پاکستان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ بلوچستان ایران میں شامل ہو جائے گا۔ شمالی مغربی سرحدی صوبہ افغانستان، پنجاب اور سندھ بھارت کے ساتھ مل جائیں گے"۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ پورا کشمیر بھارت کے حوالے کر دیا جانا چاہیئے۔

پروفیسر بلراج مدھوک نے جو "پیش گوئی" کی ہے۔ وہ امریکی حکمت عملی کے عین مطابق ہے۔ بلکہ اس کا چربہ ہے۔ پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے ہونے کی صورت میں ہی ایشیا میں فضا امریکی مفادات کے حق میں ہمیشہ کے لیے "کارساز" ہو سکتی ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بیجا نہ ہوگا کہ تقسیم ہند کے وقت امریکہ کے دفتر خارجہ کو برصغیر کے بارے میں ایک انڈین سول سرونٹ سر اولف کیرو نے معلومات فراہم کی تھیں اور معلومات یہ تھیں۔

● برصغیر کے مغرب پر نظر ڈالی جائے تو پاکستان اور کسی حد تک بھارت کے ثقافتی رشتے عرب دنیا کے کسی حصے کی نسبت ایران سے زیادہ قریب ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہیں کہ غیر منقسم برصغیر میں مسلم تہذیب کی جڑیں مغل اور پٹھان خاندانوں کے عہدِ حکومت میں مضبوط ہوئیں جو خراسان کی تہذیب سے ابھر کر ہندوستان آئے تھے۔ عرب سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ گو وہ اسلام کے مضبوط رشتے میں ایک دوسرے سے وابستہ تھے۔

● ایک احساس یہ ہوتا ہے کہ دریائے سندھ کے بالائی علاقے تک ایرانی روح اپنا وجود پھیلائے ہوئے ہے۔ یہاں کا پس منظر ایک ہے۔ ثقافت ایک ہے۔ اظہار کا انداز ایک ہے اور روحوں کی یہ ہم آہنگی پشاور اور کوئٹہ تک ہر جگہ نظر آتی ہے۔

● کراچی بلوچستان کے مشرق میں دریائے سندھ کے دہانے کے قریب واقع ہے۔ کراچی ماضی میں خلیج میں داخل ہونے کے لیے ایک اہم بندرگاہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اب یہ شہر جنوبی ایشیا کا انتہائی اہم ترین ہوائی اور بحری اڈہ ہے۔

● بھارت اور پاکستان میں بعض خطرناک اختلافات موجود ہیں۔ چنانچہ اس علاقے میں کسی بھی متحدہ دفاعی ڈھانچے کی تشکیل کے بارے میں مباحثے سے پہلے سرحدوں کی موجودہ ساخت میں تبدیلیاں لازماً آنی چاہیئں۔ (کیرو کے مضامین کے یہ اقتباسات پاکستان فورم کینیڈا مارچ اپریل ۱۹۷۳ء سے لیے گئے ہیں)

ڈلس نے اپنی معلومات کی بنیاد پر برصغیر کے بارے میں امریکی خارجہ پالیسی مرتب کی تھی اور ہو سکتا ہے کہ اب واشنگٹن ایشیا میں فضا مستقلاً اپنے مفادات کے حق ساز گار بنانے کے لیے کیرو کے مشورے کے مطابق سرحدوں کی موجودہ ساخت میں تبدیلیاں لائیں۔

ترکی

ٹکا خاں کی وضاحت

سابق وزیر مملکت برائے دفاع جنرل ٹکا خاں کا الفتح کے گذشتہ شمارے میں ایک انٹرویو شائع ہوا ہے جس میں ترکی سے متعلق ایک سطر غلط فہمی سے شائع ہوگئی ہے۔ جنرل ٹکا خان نے اس سطر کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ ترکی کی افواج کا میں بے حد احترام کرتا ہوں کیونکہ ترک سپاہی دنیا کا بہترین جنگجو ہے۔ جنرل صاحب نے کہا کہ میں نے اپنے انٹرویو میں یہ کہا تھا کہ گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے ترکی میں CONSCRIPTIN رہی ہے۔ یعنی ترکی میں ڈیڑھ سو سال سے ہر بالغ مرد کے لئے فوجی تربیت لازمی رہی ہے۔ اس لئے ترک ایک ایسی قوم ہے جس میں سب سولجر ہیں اور نسل در نسل یہ لوگ ملک کے دفاع کی تربیت حاصل کرتے ہیں۔ ترک قوم میں اپنی افواج مقبول ہیں۔ انہوں نے کہا گذشتہ چند سالوں سے ترکی میں جمہوری پارٹیاں سیاسی استحکام حاصل نہیں کر سکیں۔ ملک کو سیاسی استحکام دینا فوج کا کام نہیں ہے بلکہ سیاست دانوں کا اپنا کام ہے۔

پشاور

زندگی کی تھکن، زندہ رہنے کی تڑپ اور مہنگائی کا پہاڑ

شہزاد غزنوی

عجب قہر قیامت ہے۔ زندگی ہاتھوں سے نکلی جا رہی ہے۔ سانس ٹوٹنے کو ہیں، اعصاب جواب دے رہے ہیں۔ حوصلے پست ہو رہے۔ وہ لمحہ آتا دکھائی دے رہا ہے جہاں زندگی کی تھکن زندہ رہنے کی خواہشوں پر چھا رہی ہے۔ عجب قہر قیامت ہے۔

جس دل کو ہاتھ لگاؤ، دھڑکن سے بیزار، جس آنکھ میں جھانکو، غم کی اتھاہ گہرائیاں، جس ذہن کو چھوؤ، جلتے الاؤ کی لپٹیں، پوری کی پوری زندگی کی عمارت زندگی کے بوجھ تلے ٹوٹنے کو تیار ۔۔۔ ایک عام آدمی کہاں جائے۔ اس کے دل سے نکلتی ہوئی بازگشت اب خود اس کے ذہن کے گنبد سے ٹکرا ٹکرا اسے زخمی کر رہی ہے ۔۔۔ میں نہیں جانتا، سرحد کے باہر کے لوگ کیسے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میں سرحد میں ہر آنکھ کو زخمی دیکھ رہا ہوں۔ فکر کی جلتی آگ ہر دیکھنے والے کو جھلسا رہی ہے۔ کیوں ۔۔۔؟ آخر کیوں، انسان اس قدر بے بس کیوں ہو رہا ہے۔ میرا پڑوسی کہتا ہے۔

میں تیس سال کی عمر میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ چار بچوں کے ساتھ زندگی بسر کرنا عذاب ہو گیا ہے۔ پہلے بھی یہ دکھ تھے لیکن چند سکوں کے بڑھنے سے زندگی کی دم توڑتی نبضیں اپنی رفتار کو درست کر لیتی تھیں لیکن اب حکومت کے ذمہ دار افراد کہتے ہیں وہ مزدور کو ہڈی نہیں ڈال سکتے اور مزدور روٹی نہیں مانگ سکتا کہ روٹی مانگنے پر کون اپنی تین نسلیں تباہ کرنے کا حوصلہ کرے۔

بات میرے پڑوسی کی نہیں پورا سرحد جل رہا ہے۔ مہنگائی کا جہنم ہر دکھی دل کو جلا کر خاک کیے ہوتے ہے۔ جس چیز کو ہاتھ لگایئے گرفت سے باہر نکل جاتی ہے۔

مہنگائی ایک عفریت کی طرح ہر گھر میں داخل ہو کر اس سے سکون کے لمحے چھین رہی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جہاں جہاں بھی سرمایہ دارانہ، جاگیردارانہ نظام کی گرفت ہوتی ہے وہاں مہنگائی دبے قدموں داخل ہو کر ایک طبقے کو مکمل مفلوج کر دیتی ہے لیکن جس قدر مہنگائی کے گہرے اثرات ان دنوں لوگوں کو مجروح کر رہے ہیں اس سے قبل سرحد نے یہ منظر دیکھے نہ تھے۔ جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ آٹے کی غیر معمولی گرانی اور بازار سے اشیاء کا غائب ہو جانا ہے۔ کبھی آٹا دکھائی نہیں دیتا، کبھی تیل اور کبھی گھی باری باری نایابی کے ذیل میں آجاتے ہیں۔ ان دنوں آٹے کی گرانی نے ریکارڈ قائم کیئے ہیں۔ اس وقت کھلے بازار میں آٹے کا بھاؤ اسی روپے سے سو روپے من تک ہے۔ شہروں میں رہنے والے تو چلئے اسی روپے لے کر گزارہ کر لیتے ہیں لیکن دور دراز کے دیہی اور قبائلی علاقوں کو سب سے زیادہ اس عذاب سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ اگر وہ اسی روپے یا نوے روپے من آٹا خرید کر اپنے علاقوں میں لے جاتے ہیں، تو وہ آٹا کسی طرح بھی ۱۱۰ روپے سے ۱۲۰ روپے تک فی من سے کم نہیں پڑتا۔ اس طرح جو محدود آمدنی کے لوگ ہیں، انہیں اپنی آمدنی کا زیادہ حصہ صرف آٹے کی خرید پر صرف کرنا پڑ رہا ہے اور باقی پوری زندگی مفلوج ہوتی جا رہی ہے۔ پہلے کباڑی بازاروں میں پھٹے پرانے کوٹ خریدنے والوں کی بھیڑ دکھائی دیتی تھی، پھر بمبانی پتلونوں اور اب پرانے جوتے اور جرابیں بھی کباڑیوں سے خرید کر تن ڈھانپنے کی نوبت آچکی ہے۔

کون جانے زندگی کس رخ جا ٹھہرے۔ ان دنوں میری ملاقات مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے ہوئی۔ عام آدمیوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ احتساب کس کا اور کیوں ہو رہا ہے، اسے اس سے بھی دلچسپی نہیں کہ اسلامی مشاورتی کونسل کب اسلامی نظام کو رائج کرے گی۔ لوگوں کو تو یہ شکایت ہے کہ وہ اس مہنگائی کے عذاب سے کیسے نجات پائیں۔ کوئی ان کا پرسان حال نہیں۔ لوگ شکایت کرتے ہیں کہ پہلے جو کچھ بھی تھا، آسائش زندگی نہ سہی ضروریات زندگی اس قدر قوت خرید سے باہر نہ تھی۔ چیزیں مل جاتی تھیں لیکن اب زندگی تاریک ہوتی جا رہی ہے۔

یہ سب کیوں ہو رہا ہے، اس کا ٹھوس معروضی حالات کے پس منظر میں جائزہ لیا جائے تو وجہ صاف نظر آجائے گی۔ سرحد میں اسمگلنگ کی لعنت کچھ اس طرح چپکی ہے کہ یہاں کا حصہ دکھائی دینے لگی ہے۔ باہر سے سامان تعیش سمگل کر کے پورے پاکستان میں باڑہ قائم کرنے والے لوگ جواباً یہاں سے اجناس خوردنی اسمگل کر کے افغانستان پہنچا دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں کا سرمایہ دار اجارہ دار طبقہ جس کے پاس ملیں اور دوسرے ذرائع پیداوار ہیں۔ وقتاً فوقتاً اجناس کو روک کر اور جعلی بحران پیدا کر کے من مانے دام وصول کرتا ہے۔ اگر سول حکومت ہو تو عوام کی چیخ و پکار کے جواب میں چھپی اشیا باہر بازار میں آجاتی ہیں۔ لیکن اگر ساری حکومتی مشینری احتساب احتساب پکارتی پھر رہی ہو تو چور اچکے، منافع خور، ذخیرہ اندوز آڑھتی اور تمام اجارہ دار وہی حالات پیدا کر دیتے ہیں جس کی زد میں اس وقت سرحد کے لوگ آئے ہوئے ہیں۔ آٹا، چینی گھی، تیل اور دوسری ضروریات زندگی یا تو گم کر دی جاتی ہیں یا انتہائی مہنگے داموں فروخت ہوتی ہیں۔ اگر انسان کو زندہ رہنا ہے تو اسے بچے بیچ کر بھی آٹا خریدنا ہو گا۔

ہائی سکول کی عمارت جہاں
امدادی کیمپ قائم کیا گیا تھا

تصاویر: ایم طاہر

صداواہ میں
شگاف
پولیس کے قبضے سے
رہا ہونے والوں
کی زبانیں
بند ہیں

شاہ پور چاکر میں قیامت

محمد نواز خلجی

شہر کی ایک گلی جس میں شگاف سے بہنے والا پانی بھرا ہوا ہے

نہروں کی مرمت کرنے والے ٹھیکیداروں سے کب پوچھا جائے گا

نواب شاہ شہر سے پندرہ میل دور سانگھڑ ضلع کا شہر شاہ پور چاکر رات کی تاریکی میں ڈوبا ہوا ہے لوگ باگ اپنے اپنے گھروں میں خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے ہیں گلیاں اور بازار سنسان پڑے ہوئے ہیں۔ ہر طرف خاموشی طاری ہے کسی طرف بھی زندگی کے آثار دکھائی نہیں دیتے البتہ کبھی کبھی کسی "کتے" کے بھونکنے یا کسی چوکیدار کی "جاگتے رہنا" کی آواز شاہ پور چاکر شہر پر چھائی ہوئی خاموشی کو لمحہ بھر کے لیے توڑ دیتی ہے جس کے باعث اس شہر میں زندگی کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ شاہ پور چاکر ایک چھوٹا سا شہر ہے جس کی آبادی ۲۰، ۲۵ ہزار افراد پر مشتمل ہے آبادی کا بیشتر حصہ غریب محنت کش اور متوسط طبقہ سے تعلق رکھتا ہے جو قرب و جوار کے کھیتوں میں کام کرتے ہیں یا پھر دکاندار یا چھوٹے چھوٹے زمیندار ہیں۔

۲۵ فروری کی رات کا ایک بج چکا ہے شاہ پور چاکر شہر پر مکمل سکوت طاری ہے کہ اچانک منگن ہار قوم کے محلہ سے شور و غوغا کی آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئیں اس کے ساتھ ساتھ زوردار دھماکے بھی سنائی دینے لگے۔ شاہ پور چاکر کے باسی گہری نیند سے بیدار ہونا شروع ہوئے۔ اور آنکھیں ملتے ہوئے اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل کر ایک دوسرے سے اس شور کے بارے میں معلوم کر ہی رہے تھے کہ اچانک ہی چیخ و پکار شور و غوغا اور دھماکوں کی آوازیں سومرو محلہ، سونارو محلہ اور خاکروبوں کے محلہ سے بھی بلند ہونا شروع ہو گئیں لوگ حیرانی کے عالم میں ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ کہ یہ آوازیں کیسی ہیں لوگ کیوں چیخ رہے ہیں۔ کیا کسی ڈاکوؤں کے گروہ نے شہر پر حملہ کر دیا ہے۔ یا کوئی خوفناک عفریت شہر میں گھس آیا ہے۔ بہرحال ہر شخص اس معمہ کو حل کرنے میں مصروف، دوسری طرف چیخ و پکار کی آوازوں میں شدت پیدا ہو چکی تھی ہر لمحہ ان میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد مسجدوں کے لاؤڈ اسپیکروں سے یہ اعلان ہونے لگا کہ شہر کے قریب سے بہنے والی نہر صداواہ میں شگاف پڑ گیا ہے اور نہر کا پانی تیز رفتاری کے ساتھ شہر میں داخل ہو چکا ہے۔ لوگوں کو چاہیئے کہ وہ حفاظتی اقدام کر لیں۔ اب پورا شہر جاگ چکا تھا عورتیں خوف زدہ تھیں کہ اب کیا ہوگا۔ بچے ماؤں کے سینوں سے چمٹے ہوئے تھے کچھ لوگ اپنے اپنے گھروں کی ضروری و قیمتی اشیاء سمیٹ رہے تھے اور کچھ افراد متاثرہ لوگوں کی امداد کے لئے متاثرہ علاقے میں پہنچکر امدادی کاروائیوں میں مصروف ہو گئے۔ پانی گھروں میں داخل ہو چکا تھا کچے مکان دھماکوں کے ساتھ زمین بوس ہو رہے تھے۔ غریب لوگ گرتی دیواروں کی پرواہ کیے بغیر اپنے مکانوں سے اپنا سرمایۂ زندگی جو آٹے کا کنستر کچھ پھٹے پرانے کپڑے اور چند کھانے پینے کے برتنوں پر مشتمل تھا۔ بچانے کی سر توڑ کوشش کر رہے تھے۔ بچے، عورتیں، بوڑھے جوان کمر کمر پانی سے گزر کر محفوظ مقامات کی طرف بھاگ رہے تھے۔

شگاف کی اطلاع ملتے ہی فوج کے جوان پولیس کے دستے، انتظامیہ کے افسران بھی موقعہ پر پہنچ گئے شہر کے پختہ ہائی اسکول میں امدادی کیمپ قائم کر دیا گیا شہریوں نے ہمت سے کام لیکر فوری ایک نیا پشتہ تعمیر کرنا شروع کر دیا۔ تاکہ پانی کا رخ موڑ کر بقایا شہر کو بچایا جا سکے ان کی محنت بار آور ہوئی اور وہ باقی شہر کو بچانے میں کامیاب ہو گئے انتظامیہ نے قرب و جوار کے دیہاتیوں اور شہریوں کی مدد سے شگاف پر کرنے کی کوششیں شروع کر دیں لیکن پانی کے تیز بہاؤ کی باعث ان کی ہر کوشش رائیگاں گئی۔ لہذا نصرت ڈویژن کے انجینئر جناب مسعود ارباب نے اصل شگاف سے چار فرلانگ دور ایک مصنوعی شگاف ڈلوا دیا۔ تاکہ پانی کے بہاؤ کی شدت میں کمی واقع ہو سکے اس کے بعد شگاف کو بند کرنے کی کوششیں تیز کر دی گئیں

ابتدائی اندازے کے مطابق شگاف سے ۱۰ لاکھ روپے کی مالیت کا نقصان پہنچا جبکہ سینکڑوں ایکڑ رقبے پر گندم کی فصلوں کو جو نقصان پہنچا ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔

شاہ پور چاکر کے عوام سوچ رہے ہیں یہ شگاف کیونکر پڑا۔ کیا یہ محکمہ انہار کی غفلت اور لاپرواہی کا نتیجہ ہے کیونکہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ہر سال محکمہ کو ایک معقول رقم نہروں کی صفائی اور کھدائی کے لیے فراہم کی جاتی ہے لیکن وہ رقم صحیح طور پر خرچ نہیں ہوتی جبکہ پشتوں کو مضبوط بنانے کے لیے پشتوں کے قریب سے ہی مٹی کھود لی جاتی ہے جس کے باعث پشتے کمزور ہو جاتے ہیں اور ان میں شگاف پڑنا شروع ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات جنگلی چوہے بھی پشتوں میں سوراخ کر کے شگاف کا باعث بن جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ محکمہ انہار سے ملی بھگت کر کے پانی چوری کرنے والے زمیندار بھی شگاف

صداواہ نہر میں پڑنے والا شگاف، پانی تیزی سے شہر کی طرف بڑھ رہا ہے

بے گھر ہونے والے افراد

زمین بوس ہونے والے ایک مکان کا منظر

ڈالنے کا موجب ہوتے ہیں۔ الغرض ہر شخص اپنی اپنی سمجھ کے مطابق شگاف کے معمّے کو حل کرنے کی سعی کر رہا تھا لیکن نصرت ڈویژن کے انجینئر مسعود ارباب نے معائنہ کے بعد شگاف کو تخریب کاری کا واقعہ قرار دیا اور تھانہ میں رپورٹ بھی درج کرا دی گئی۔

سانگھڑ ضلع کی انتظامیہ فوری حرکت میں آگئی اور شاہ پور چاکر کے قرب و جوار کے دیہاتوں سے ایسے افراد کی گرفتاری کا سلسلہ شروع ہو گیا جن پر کسی طور شگاف ڈالنے کا شبہ کیا جا سکتا تھا۔ پولیس اور مارشل لا حکام کو شگاف سے متعلق تخریب کاری کا اس لیے بھی یقین سا ہو گیا تھا کیونکہ اسی شب پولیس کو ماڈھا اور شاہ پور چاکر ریلوے اسٹیشنوں کے درمیان ریلوے لائن پر رکھا ہوا آتش گیر مادہ بھی ملا تھا۔ جس سے

بقیہ صفحہ ۳۸ پر

نئی واردات، سوالات اور اندیشے

فوکر کا اغوا، شاہ پور چاکر نہر میں شگاف اور اب جمبو جیٹ

سول ایوی ایشن کا ایک شخص ٹاور سے دوڑتا ہوا بڑے صاحب کے کمرے کی طرف آرہا ہے۔ وہ کسی آداب کا خیال کئے بغیر صاحب تک پہنچ جاتا ہے۔ صاحب ٹیلی فون پر کسی سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہیں۔ وہ ان خوشگوار لمحوں میں اس کی آمد سے ناخوشگواری کی بو سونگھتے ہیں۔ ان کے ماتھے پر تیوریاں ابھر آتی ہیں۔ چند لمحوں کے لئے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر ناگوار استفہامیہ نظروں سے آنے والے کی طرف دیکھتے ہیں۔ آنے والا کچھ کہتا ہے۔ اچانک صاحب کے ہاتھ سے ٹیلی فون کا ریسیور چھوٹ جاتا ہے۔ ان کی پوری کرسی کانپ جاتی ہے وہ بڑی مشکل سے خود کو سنبھالتے ہیں۔ اور پھر سول ایوی ایشن کا پورا عملہ تیز تیز قدم چلنا شروع ہو جاتا ہے۔ کوئی اونچی آواز میں نہیں بول رہا۔ ہر کوئی ایک دوسرے کے کان میں کچھ کہتا ہے۔ سیکیورٹی کے عملے کے چہرے ہلدی جیسے زرد ہو جاتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں ہمیشہ ناچنے والی دہشت کی جگہ خوف کے سائے لہرا رہے ہیں۔ اچانک سرگوشیوں کا سینہ چیر کر آواز باہر آتی ہے۔

"پی آئی اے کا جمبو جیٹ طیارہ ہائی جیک ہوگیا۔"

پھر جتنے منہ اتنی سرگوشیاں اتنی ہی افواہیں جنم لیتی ہیں۔ کوئی کچھ نہیں جانتا، ہر کوئی ایک نئی بات کہتا ہے کوئی طیارے کا رخ ماسکو کی طرف کر رہا ہے، تو کسی کو کرنل قذافی کے لمبے ہاتھ نظر آتے ہیں، کوئی یاسر عرفات کے وجود کو ٹٹول رہا ہے کوئی اپنی ذہنی پرواز میں کسی پارٹی کا نام لکھ رہا ہے۔ طیارہ فضا میں ہے لیکن بے شمار بھنبھناہٹیں زمین پر گردش کر رہی ہیں۔

فوراً خیال اسی فلائٹ نمبر ۳۰۰ پی کے سے گئے ہیں۔ خدا خیر کرے۔ کیا معلوم غلطی سے اس بار گولی کو لے کی بجائے کہیں اور لگ جائے۔ پی آئی اے کے دو کارکن تشویش کا اظہار کرتے ہیں۔

پی آئی اے کی شہرت کو نقصان پہنچ رہا ہے۔

یہ ایئرپورٹ سیکیورٹی کے سفید ہاتھی کس لئے پال رکھے ہیں۔ کیا چڑیاں کرانے کے لئے۔

یہ بھٹو صاحب کا دیا ہوا ایک عذاب ہے۔

ابھی سرگوشیوں کا پیٹ نہیں بھرتا کہ طیارے کے راولپنڈی ایئرپورٹ پر اترنے کی خبر آتی ہے۔ اور تشویش زدہ چہروں پر حیرت کی لکیریں ابھرنے لگتی ہیں اور پریشانی کی جگہ پرسکون قیاس آرائیاں لے لیتی ہیں۔ واقعات سامنے آتے ہیں۔

جمبو جیٹ جس میں ۲۵۰ مسافروں کی گنجائش ہوتی ہے ۳ مارچ کی صبح پرواز نمبر ۳۰۰ پر کراچی سے روانہ ہوا اور بخیر راولپنڈی میں اتر گیا۔ اور پھر پروگرام کے مطابق راولپنڈی ایئرپورٹ سے ۱۰ بج کر ۵۰ منٹ پر اس نے ٹیک آف کیا لیکن ٹھیک پندرہ منٹ بعد یعنی ۱۱ بج کر ۵ منٹ پر ایک شخص ۲۴ ویں رو سے اٹھتا ہے۔ وہ ایک مختصر سی "تقریر" کرتا ہے، لوگوں کو تنبیہ کرتا ہے کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت نہ کریں اور یہ جو اغوا ہونے سے بال بال بچ گیا ہے اس کے ڈھانچے، نشستوں کی تفصیل اور حصوں کو سمجھ لیا جائے تاکہ ہائی جیکر اور ہائی جیکنگ کے پس منظر کو سمجھا جاسکے۔

اس نقشے کو دیکھ کر بآسانی سمجھا جاسکتا ہے کہ اس طیارے میں مسافروں کے بیٹھنے کے لئے تین چار حصے ہیں۔ پہلا حصہ فسٹ کلاس اور اکانومی کلاس کو الگ کرتا ہے اور دونوں حصے والے ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے۔ اسی طرح کاک پٹ والا حصہ پچھلے حصے سے پورا نہیں دیکھا جاسکتا اور پھر اسی طرح پچھلے دونوں حصے بھی ایک دوسرے سے ایک راہداری اور کچن کے سبب الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ دوسرا ایک اوپر کی منزل ہے۔ جو نیچے سے بالکل الگ ہے۔ چنانچہ معلوم یہ ہوا کہ ایک

یہ سب کچھ کیا ہے، منصوبہ بندی کے تحت یا....
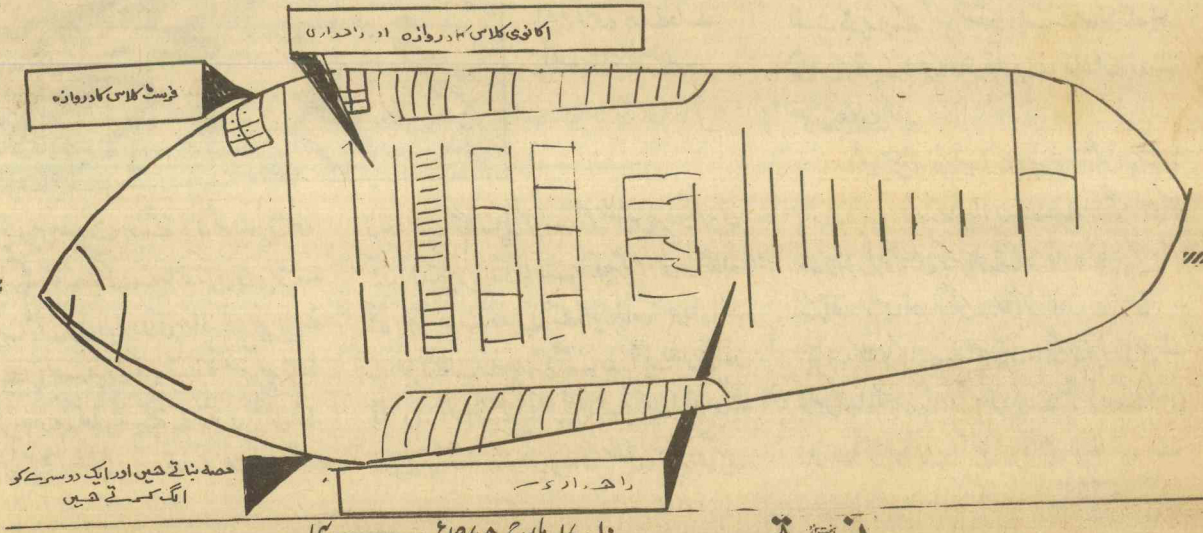
شخص کہتا ہے کہ ہم دلی جا رہے ہیں۔ اسی لمحے ایک اور شخص اٹھتا ہے اور پیچھے سے آ کر اُسے جپھی ڈال لیتا ہے۔ ہائی جیکر کے ہاتھ میں ہینڈ گرنیڈ ہے اس کی پن کھینچ جاتی ہے۔ ایک دھماکہ ہوتا ہے اور ہائی جیکر جس کا نام سید حسین ہے اپنا بازو کٹوا کر گر پڑتا ہے اور ہائی جیکر پر قابو پانے کے بعد جہاز صحیح و سلامت ۱۱ بج کر ۲۰ منٹ پر واپس راولپنڈی میں اتر جاتا ہے۔ یعنی ۱۵ منٹ میں ایک کھیل ختم ہو جاتا ہے۔ اس میں چند لوگ زخمی ہوتے ہیں جنہیں سی ایم ایچ میں داخل کر دیا جاتا ہے۔

ان سارے واقعات کو دیکھنے اور تمام مسافروں اور پی آئی اے کے عملے کی سرگذشت سننے کے بعد چند سوال ذہن میں ابھرتے ہیں لیکن ان سوالات کو سامنے لانے سے قبل یہ ضروری ہے کہ جمبو جیٹ طیارہ جمبو جیٹ کو اغوا کرنے کے لئے ایک نہیں بلکہ سے زائد ہائی جیکرز کی ضرورت ہوگی۔ جیسے کہ اب تک بین الاقوامی سطح پر ہائی جیکنگ کے واقعات سامنے آ چکے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ ہائی جیکر کون تھا کیا تفننِ طبع کے لئے اس نے یہ ڈرامہ رچایا؟ ظاہر ہے کوئی شخص محض تفننِ طبع کے لئے اتنا بڑا کھیل نہیں کھیل سکتا۔

کیا ہائی جیکر کسی بین الاقوامی ہائی جیکنگ گروپ سے تعلق رکھتا ہے۔ تو سب سے پہلے یہ خیال گزرتا ہے کہ کوئی گروپ جو بین الاقوامی طور پر طیاروں کے اغوا یا دہشت گردی کرتا ہے اس کے ساتھ وابستہ لوگوں پر نہ تو کوئی اچانک حملہ کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی تنظیم اپنے کسی ایک "جبرو" کو اتنے بڑے کام پر تعینات کر کے داؤ پر لگا سکتی ہے۔ کہ ان کے نزدیک ایک ایک شخص طیاروں اور طیارے میں موجود افراد سے زیادہ قیمتی ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ کہنا قرینِ قیاس ہے کہ سید حسین یقیناً کسی بڑی تنظیم کا رکن نہیں۔

تو پھر کیا سید حسین کسی ملکی پارٹی کا آلۂ کار ہے۔ اس سوال پر غور کرتے ہی یہ خیال گزرتا ہے کہ کون سی پارٹی یا افراد ایک شخص سے جمبو جیٹ طیارے کو اغوا کرانے کی حماقت کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے اس طرح کی حرکات سے کسی فرد یا افراد یا پارٹی کو فائدہ نہیں پہنچایا جا سکتا۔ کیونکہ ہائی جیکنگ کا سب سے بڑا مقصد اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے اور دہشت پھیلا کر سیاسی مقصد کا حصول ہوتا ہے اب تک کے دونوں واقعات کو دیکھا جائے تو یہ بات جچی نہیں لگتی ہے، کہ ایک آدمی جو جمبو جیٹ جیسے دیوہیکل طیارے کو اغوا کرنے تنہا نکلا ہے کوئی بڑا مقصد رکھتا ہوگا۔

اس جمبو جیٹ طیارے کے ہائی جیکر (اگر وہ واقعی ہائی جیکر ہے) تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ فاترالعقل اور حواس باختہ شخص ہے۔ میری بات کی تائید واقعات کرتے ہیں۔ مثلاً۔

(ا) وہ تنہا ایک ایسے بڑے طیارے کو اغوا کرنے نکلا ہے۔ جس کے پانچ حصے ہیں جو ایک دوسرے سے الگ ہیں۔

(ب) اس کے پاس ایک ہینڈ گرنیڈ ہے۔ جو چند قدموں سے آگے نقصان پہنچانے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے۔ اور وہ جہاز کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکا۔ اور جہاز واقعے کے ایک گھنٹے کے بعد پرواز کر کے کراچی باخیریت پہنچ گیا۔ یعنی ایک ہائی جیکر جو آدھے شہر جتنے بڑے طیارے کے اغوا کی غرض سے چلا ہے۔ اپنے پاس ایک معمولی گرنیڈ کے سوا اور کچھ نہیں رکھتا۔ اغوا کرنے والے نہ صرف دُھند مار کے اسلحہ سے لیس ہوتے ہیں بلکہ گتھم گتھا ہونے کی صورتِ حال کے لئے بھی تیار ہوتے ہیں، نیز گرنیڈ وہ اس لئے ساتھ لے کر آتے ہیں کہ جب مقصد کے حصول کے سارے دروازے بند ہو جائیں تو وہ اپنے ساتھ جہاز کو بھی تباہ کر لیں لیکن یہاں بات الٹ ہے۔ وہ جس گرنیڈ کو ساتھ لایا ہے اور وہ جہاں کوئی نقصان پہنچانے کی صلاحیت سے محروم ہے

(ج) اس کے پاس پستول برآمد ہونے کی خبر نہیں آئی۔

(د) ہائی جیکر جب اپنی نشست سے اٹھتا ہے تو وہ سب سے پہلے جہاز کے کپتان (پائیلٹ) پر قابو پانے کی بجائے لوگوں سے کہتا ہے کہ وہ خبردار رہیں اور جہاز دلی جا رہا ہے یعنی وہ شخص جو جہاز چلا رہا ہے۔ اسے قابو میں کئے بغیر ہائی جیکر کا "عوام" سے مختصر "خطاب"

بقیہ صفحہ ۳۸ پر

ایک پہلو یہ بھی

جمبو جیٹ کے اغوا کی ناکام کوشش کے بارے میں انکوائری شروع ہو چکی ہے۔ یقیناً اس کی کارروائی صیغۂ راز میں رکھی جا رہی ہے۔ کون جانے، کس نے کیا بیان دیا۔ جن افراد سے پوچھ گچھ کی جا رہی ہے، ان میں پی آئی اے کا وہ عملہ بھی شامل ہے جو جہاز پر مامور تھا۔

کہا جاتا ہے کہ انکوائری کے سامنے یہ بات لائی گئی ہے کہ "ملزم سید حسین نے طیارہ کے اغوا کے مقصد کے لئے جو دستی بم استعمال کیا وہ دیسی ساخت کا تھا اور اُس کی قیمت ۱۸۰ روپے تھی۔ سید حسین دستی بم کی پن منہ سے نکال کر کاک پٹ میں جانا چاہتا تھا۔ اُسے روکنے والے عملے کے ارکان تھے۔ عبدالمالک تو سید حسین سے دس نشستیں پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ اور ملزم کی پشت مالک کی طرف تھی۔ چنانچہ مالک کو کیسے معلوم ہوا کہ ملزم سید حسین طیارہ اغوا کرنا چاہتا ہے۔" انہوں نے اس شبہ کا اظہار کیا کہ عبدالمالک ملزم کا ساتھی ہو سکتا ہے اور اس کے پس منظر میں کسی "بڑے آدمی" کا ہاتھ کارفرما ہو سکتا ہے۔

مزید یہ کہ "سید حسین نے بے ہوش ہونے سے قبل چند فقرے ایسے کہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس کا مقصد طیارہ ہائی جیک کرنا نہیں بلکہ تباہ کرنا تھا۔

مزید یہ کہ سید حسین کی تنخواہ ۲۷۰ روپے ماہانہ تھی جب کہ اتنی تنخواہ پانے والا کوئی فرد ۳۷۵ روپے کا ٹکٹ خرید کر فضائی سفر کرنے کی استطاعت ہی نہیں رکھتا۔"

آزاد کشمیر

سید نذیر گیلانی

آزاد کشمیر مظفر آباد اور راولپنڈی میں استقبالیے

عالمی رائے عامہ ہموار کرنے کے لئے وفود بیرون ملک بھیجے جائیں

آزاد کشمیر میں احتساب کا عمل وقفے وقفے کے بعد دم ہلاتا دکھائی دے رہا ہے اہلِ دل اسے سیاسی رڈار سمجھ رہے ہیں سارے لوگ دل گرفتہ ہیں کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ ایسے میں بعض سنجیدہ لوگ کبھی کبھار ایک آدھ غیر سنجیدہ مگر خدا لگتی کہہ دیتے ہیں۔ اب آزاد کشمیر میں ایک یہی افواہ کانوں کان پہنچ رہی ہے کہ یارو احتساب کے ساتھ یہاں سو فیصد سدھن راج "قائم" ہو کر رہ گیا ظاہر ہے کہ جب احتساب کی دم ہمہ وقت متعدی کی بجائے کبھی کبھار ہے ایسی افواہوں کی تلاش ایک فطری تقاضا ہے۔

مسئلہ کشمیر دراصل کسی ایک نسل، تاریخ یا صدی کی بات نہیں بلکہ یہ ماضی تا حال اور مستقبل پر محیط ایک تاریخی حقیقت ہے اگر ہم اسے حل نہ کر سکے تو ہمیں آزادی کی جدوجہد کے دروازے بند کرنے کا بھی حق نہیں۔ کیونکہ آزادی کی جدوجہد ہمارے پاس ایک امانت ہے اور اس کے وارث مستقبل کے لوگ ہیں۔ ہماری آئندہ کی نسلیں اس کی وارث ہیں اگر یہ معمہ ان سے بھی حاصل نہ ہو سکا تو یہ تاریخی سلسلہ جاری رہے گا۔ یہ بات بالکل عیاں ہے کہ آج تک مسئلہ کشمیر کا سیاسی ٹینڈر چند بردہ فروش سیاستدانوں کو دیا گیا اور ابھی تک وہ کشمیر کے اس بلینک چیک کو کیش کراتے آئے۔ وقت کی ضرورت یہی ہے کہ تحریکِ آزادی کا یہ سیاسی ٹینڈر عوام کے حوالے کیا جائے اور ایک نئے عزم کے ساتھ نئی روشنیاں روشن کی جائیں ہر طبقہ خیال کی آراء تجاویز کا ایک ہمہ جہتی پروگرام شروع ہو۔ کیونکہ سیاستدانوں پر تکیہ کرنا ہی کافی نہیں۔ زندگی کے باقی شعبوں میں ہماری ذہین اکثریت ہے اور وطن داری کا حل چند ایک پیشہ واروں کے کندھوں پر لادنا سعی لاحاصل ہے! ہمیں طلباء، اساتذہ، شعبہ قانون، ادب، کسان مزدور، صحافی دانشوروں سبھوں کی مجموعی مساعی کا بندوبست کرنا ہے۔

اب یہ ضروری ہو گیا ہے کہ کشمیریوں کو پاکستان سے باہر جگہ جگہ عالمی رائے عامہ ہموار کرنے کی اجازت دی جائے اور اس کے لئے حکومتِ پاکستان جگہ جگہ اپنے سفارتخانوں سے منسلک شعبے قائم کرے۔ کشمیر کی آزادی مظفر آباد اور راولپنڈی کے ہوٹلوں میں استقبالیے اور عشائیے دیکر ممکن نہیں۔ اس کے لئے ہر نفس اور ہر پاکستانی اور کشمیری نے اپنی اپنی حیثیت میں کام کرنا ہے ابھی تک پاکستانی سیاستدانوں نے کشمیریوں پر اعتماد کرنے کے معاملے میں بخل اور تعصب سے کام [illegible] رہے ہے کہ بیرون پاکستان کشمیریوں کی تحریک سفر ہے۔

دوسرا اہم اقدام کشمیریوں کو بیرون ملک کام کے لئے خصوصی اجازت نامہ ہے کیونکہ بھارتی مقبوضہ کشمیر سے بیرونِ ہندوستان جانا بالکل ہی ناممکن ہے اور مقبوضہ کشمیر کے مسلمان کی یہ قید ہی اس کی ناکامی کی بڑی وجہ ہے۔ ہمیں چاہئیے کہ ہم ہندوستان کی اس سازش کو اپنے ہاں سے ناکام کریں۔ اور کشمیریوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں بیرون پاکستان بھیجیں۔ ہمارے اس اقدام سے مقبوضہ کشمیر کے مسلمان پر عائد قید و پابندی ساری دنیا پر واضح ہو جائے گی۔ اور احساسِ محرومی انقلاب پیدا کرے گا اس طرح ہم بغیر ہتھیار کے بھارت کے ہاتھ پاؤں زخمی کر سکتے ہیں۔ مگر بدقسمتی سے نہ ہی حکومت آزاد کشمیر نے اس پہلو پر سوچا اور نہ ہی کشمیر پالیسی سے وابستہ پاکستانی حکام کے ذہن میں یہ بات اتری۔ اس غفلت سے ہم بہت کچھ کھو بیٹھے۔ پاکستان اور آزاد کشمیر میں ایسے بے شمار کشمیری موجود ہیں جو پاکستان کی آزاد کشمیر کی پالیسی اور خارجہ پالیسی کو چار چاند لگا سکتے ہیں۔ بدقسمتی سے ان پر آج تک بداعتمادی کا پردہ پڑا رہا۔ لیکن بجائے اس کے کہ کشمیری عوام اس بداعتمادی کے خلاف احتجاج کریں اور کشمیر پالیسی کو نقصان ہو۔ بہتر یہی ہے کہ پاکستانی سیاستدان اور سربراہ فوری طور پر اس اقدام کی اہمیت کو سمجھ لیں۔ اب کشمیریوں کی کئی نسلیں زمین دوز نہیں اور نئی نسل کی سوچ میں اتنا صبر اور تحمل نہیں کہ وہ اپنے ہوش و حواس دیدہ دانستہ معطل رکھیں۔

تیسری اہم بات کشمیریوں کے لئے کئی غیر ملکی زبانوں کو لازمی قرار دیا جائے تاکہ نئی نسل مکمل طور اپنا موقف عالمی پلیٹ فارم پر بیان کر سکے۔ آج تک آزاد کشمیر سے جتنے بھی حج وفود بھیجے گئے ان میں لوگ سیاسی رشوت کے طور پر استعمال ہوئے۔ وہ اپنی گلی میں غیر معروف ہونے کے ساتھ اپنی زبان میں بھی اچھی طرح بولنے سے خوف کھاتے رہے ان حقائق سے ثابت ہوا کہ مسئلہ کشمیر کو اچھی طرح نہ سمجھا گیا۔ اور نہ ہی بے لوث رہنمائی اور ترجمانی ہوئی لیکن اب حالات کا یہی تقاضا ہے کہ اس نازک مسئلے میں ہر شخص کو کسی نہ کسی انداز میں شامل رکھا جائے اسے خالص سیاستدانوں کی تحویل میں رکھنا خود اس قوم کے مستقبل سے زیادتی ہے ہم تو یہی چاہتے ہیں کہ یہ سیاستدان بلا معاوضہ کام کریں۔ اور صرف اتنی ہی اجرت حاصل کریں جس سے ان کی گزر اوقات آسانی سے ہو ورنہ یہ سیاستکاری ایک ایسی تجارت ہے جو انسانیت کا لاشہ بیچ کر چلتی ہے اور اگر ان سیاستدانوں کا احتساب اندھیرے میں بھی کیا جائے۔ ان کی دولت کی تپش اور جھنکار قدم قدم پر محسوس ہو گی۔ اور سنائی دے گی۔ ہمیں پرانی جاگیردارانہ اور منبر دارانہ سوچ بدل کر دن رات محنت اور خلوص کی رسم نبھا کر ہی کامیابی ہو سکتی ہے ورنہ یہ سیاستکاری بالآخر مسئلہ کشمیر کو ٹکے کے بھاؤ بیچ دے گی

تیسری دنیا کے مجاہدینِ آزادی کے نام

خالد علیگ

ہم سفر دوستو!
دید ور ساتھیو!
کن جرائم کی پاداش میں آج پھر
ہم سزا یافتہ قوم ہیں
آبرو باختہ قوم ہیں
تم سے مخفی نہیں تم سے مخفی نہیں

فاقہ کش ہاریو!
سوہنی دھرتی کے مظلوم محنت کشو!

اس کھرے کھیل میں
اس بڑے کھیل میں
کون ظالم ہے اور کون مظلوم ہے
کون قاتل ہے اور کون مقتول ہے
تم سے مخفی نہیں تم سے مخفی نہیں

ہم سفر دوستو!
دیدہ ور ساتھیو!
فاقہ کش ہاریو!
سوہنی دھرتی کے مظلوم محنت کشو!
آج پھر ——
ارضِ خوں کو نئی جوئے خوں چاہیے
خوش جمالوں کا خوں
خوش خصالوں کا خوں
نونہالوں کا خوں
دشتِ پر خار کو....
—— سب غزالوں کا خوں چاہیے

اہلِ حرفہ کا خوں
اہلِ پیشہ کا خوں
اہلِ دانش کا خوں
اہلِ بینش کا خوں
ظلم کی رات کو ——
—— ساری زندہ کتابوں کا خوں چاہیے

ہم سفر دوستو!
دیدہ ور ساتھیو!
فاقہ کش ہاریو!
سوہنی دھرتی کے مظلوم محنت کشو!
خون دو، خوں دو
روشنی کے لئے
آگہی کے لئے
زندگی کے لئے
آدمی کے لئے
اگلی نسلوں کی تابندگی کے لئے

دوستو! ساتھیو! ہاریو!
سوہنی دھرتی کے مظلوم محنت کشو!
خون دو، خون دو
خون دو، خون دو

اور کچھ بدلا نہ بدلا 'امروز' کا رنگ بدل گیا

حاجی عدیل

تاریخ کے صفحات کو یاد رکھنے اور زمانے کے انقلابات پر غیر معمولی توجہ دینے کے جہاں بہت سارے فائدے ہیں وہاں ایک زبردست نقصان یہ ہے کہ بعض وقت آدمی محض ان کی وجہ سے بڑے کربناک لمحوں سے دوچار ہوتا ہے گذشتہ چند ماہ سے ہر وہ شخص جو دیدہ بینا اور تیز حافظے کا مالک ہے ایسے کربناک لمحوں سے بار بار دوچار ہو رہا ہے لیکن یہ دیدہ ورانِ ملک کہیں کس سے ؟ کس کے آگے اپنے کرب وبلا کا اظہار کریں کہ زبان گنگ ہے اشاروں کنایوں کا میدان بھی میدانِ خارزار بنا ہوا ہے۔

ہماری طرح ہر شخص کو یاد ہوگا کہ روزنامہ امروز لاہور اپنے یوم پیدائش سے لے کر یکم مارچ ۱۹۷۸ء تک سرخ لوح اور سرخ سرخیوں کے تابناک زیور سے آراستہ رہا لیکن ۲ مارچ کا امروز نیلی امریکی ٹوپی کمر بند اور بازو بند سجائے بازاروں میں در آیا۔ امروز کی یہ تبدیلی اس لحاظ سے یوں تعجب خیز اور کرب انگیز ہے کہ مارشل لا ریگولیشن نمبر ۳۳ میں اس سمت کوئی اشارہ موجود نہیں کہ اخبارات کس رنگ میں شائع کیے جائیں۔ یا ان کی سرخیوں اور لوح کا رنگ کونسا ہو۔

پریس ٹرسٹ کے اخبارات اپنی انتظامیہ کی نوازشوں کے زیر اثر یوں تو بڑے زود حس ہیں اور ان پر ملک میں ہونے والی ہر سیاسی تبدیلی کا اثر فوری طور پر ہوتا ہے لیکن اپنی تاریخ اجراء سے یکم مارچ ۱۹۷۸ء تک امروز کی لوح اور سرخیوں کا رنگ کسی بھی دور میں انتظامیہ کی نوازش کا اثر قبول کرنے کی صلاحیت ہی سے عاری تھا حالانکہ اس عرصہ میں ایوب خان کی ننگی آمریت بھی ہو گذری۔

یہ حقیقت تو ہر باشعور فرد کے علم میں ہے کہ ان گنت رنگوں میں بعض رنگ ایسے بھی ہیں جو مختلف نظریات کی علامت بن گئے ہیں۔ سرخ رنگ محنت کشوں کے ناقابلِ تسخیر نظریات کی علامت ہے اور نیلا رنگ زوال پذیر استحصالی نظریات کی علامت روزنامہ امروز پریس ٹرسٹ کے حلقہ ارادت میں آنے اور اس کی بنائی ہوئی پالیسیوں پر چلنے کے باوجود بھی اپنی پیشانی پر محنت کشوں کے علامتی رنگ کو سجائے ہوئے تھا۔ مگر اب اس سے یہ اعزاز بھی چھن گیا ہے آخر کیوں۔ ؟ اس کا جواب کون دے ؟ اور یہ سوال کس سے کیا جائے۔ ممکن ہے کہ پریس ٹرسٹ کی انتظامیہ نے مارشل لا ریگولیشن ۳۳ کو پڑھنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہو۔ چونکہ آرڈر ۳۳ کے مطابق کسی سیاسی پارٹی کا پرچار کرنا جرم ہے۔ اور بعض سیاسی جماعتوں کے پرچموں کا رنگ سرخ ہے یا ان کے پرچموں میں سرخی شامل ہے۔ ظاہر ہے یہ رنگ اخبار کی پیشانی اور سینے پر ملنے کا مطلب مارشل لا ریگولیشن ۳۳ کی خلاف ورزی متصور ہو سکتی ہے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ مزدوروں کے پرچم کا رنگ سرخ ہی ہے اور مارشل لا انتظامیہ نے مزدوروں کی "خلوص نیت" سے کی جانے والی سرگرمیوں پر کوئی پابندی عائد نہیں کی۔ اگر پریس ٹرسٹ کے ارباب حل وعقد ریگولیشن نمبر ۳۳ کے "خلوص نیت" والے نکتہ کو سامنے رکھنے کی زحمت گوارہ کرتے تو انہیں استحصالی نظریات کا عکاس رنگ امروز کی پیشانی پر ملنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ جہاں تک امروز کی خبروں کے "موڈ" کا تعلق ہے تو وہ پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈیننس کی موجودگی اور پریس ٹرسٹ کے ارباب حل وعقد کی "بریفنگ" کے زیر سایہ "صراط مستقیم" ہی پر رواں دواں پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے ان موڈ کے اس بال سے باریک اور تلوار کی دھار سے تیز راستے سے ہٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بات میں سے بات نکالنے کا کام تو کچھ لوگ بڑی مہارت سے کرتے ہیں لیکن ہمیں چونکہ یہ کام آتا ہی نہیں تو مہارت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن اس کو کیا جائے کہ مذکورہ بالا باتوں میں سے ایک بات اچک اچک کر ہمارے قلم کے نیچے آ رہی ہے اور ہم بحالتِ مجبوری اس کو بھی ضبط تحریر میں لانے کی جرأت کر رہے ہیں بات یہ ہے کہ پریس اینڈ پبلیکیشنز آرڈیننس کا دائرہ کچھ بہت زیادہ وسیع نہیں تھا جب ہی تو چوری چکاری، لوٹ کھسوٹ، رہزنی، ڈاکہ، فراڈ، اسمگلنگ قتل، زنا، اور اغوار جیسے جرائم کی خبروں کی تشہیر اشاعت پر روک ٹوک اس مشہور زمانہ آرڈیننس کے دائرے سے باہر ہی رہی۔ اور اب ریگولیشن ۳۳ کا دائرہ بھی ان خبروں کی تشہیر واشاعت کو اپنی گرفت میں لینے سے قاصر ہی ہے یہی وجہ ہے کہ آج کل اخبارات کا پیٹ بھرنے کے لیے جرائم کی چٹخارے دار اور لذت آفریں کہانیاں شائع کی جا رہی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بعض اخبارات جو سیاسی خبریں تلاش کرنے اور انہیں سب سے پہلے لوگوں تک پہنچانے کا تمغہ اعزاز اپنے سینوں پر سجائے ہوئے تھے۔ آج وہ بھی مجبوراً "جرائم کی دبی ہوئی یا فراموش کردہ کہانیوں کی تلاش میں اپنے رپورٹروں اور نامہ نگاروں کو سرگرداں کیے ہوئے ہیں اور موصول یا حاصل شدہ خبروں کی وہ حضرات جو خبروں کی روح کو سرخی میں مقید کرنے کے فن میں ید طولیٰ رکھتے ہیں ان خبروں کی ایسی ایسی سرخیاں لگا رہے ہیں کہ رہے نام سائیں کا۔ یہ بے چارے بھی کیا کریں۔ ان پر اب دوہری ذمہ داری آ پڑی ہے۔ ایک یہ کہ خبروں کی روح کو سرخیوں میں کشید کریں۔ تاکہ وہ لوگ اخبارات کو ہاتھ میں اٹھا کر پڑھنے کی زحمت گوارہ کریں۔ جو صرف سیاسی خبریں پڑھنے کے رسیا ہیں۔ ظاہر ہے کہ اخبار بین حضرات میں ان کی تعداد پچانوے فیصد بنتی ہے اور اگر یہ پچانوے فیصد افراد اخبار پڑھنا چھوڑ دیں تو پھر اخبارات کی سرکولیشن اللہ کو پیاری ہو جائے اور جب کسی اخبار کی سرکولیشن اللہ کو پیاری ہوتی ہے تو اس اخبار میں کام کرنے والے افراد کی نوکری بھی اللہ ہی کو پیاری ہو جاتی ہے دوسری ذمہ داری ان نوکری کے چلے جانے کے اندیشے کے مارے ہوئے افراد کی یہ ہے کہ کسی طرح ان پچانوے فیصد افراد کو جو سیاسی خبروں کی "لذت" یعنی "لذت سنگ" کے مارے ہوئے ہیں انہیں "لذت جرم" کا اسیر کریں۔ اسی مقصد یا "احساس ذمہ داری" کے تحت ہماری برادری یعنی صحافی الفاظ کی تراش خراش جملوں کے زیر وبم اور دلوں میں ہلچل پیدا کرنے والی سرخیوں کے ذریعے پچانوے فیصد حلقہ قارئین کو پہلے متوجہ اور پھر اس "افیون" کا عادی بنانے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں اس ضمن میں ان سماج سدھار ٹھیکہ داروں کا تذکرہ بھی ضروری ہے جو جرائم اور فحاشی کی بڑھتی ہوئی دبا کو

(باقی صفحہ ۲۳ پر)

کچھ کچھ سچ کچھ جھوٹ

میرے دوستوں کا کہنا ہے کہ الفتح کے لیے جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ سراسر بکواس ہے۔ اور یہ کہ میرے کالم پڑھنے سے عام لوگوں کا بھلا نہیں ہوتا۔ میرے کالم پڑھنے سے قارئین کی عام معلومات میں اضافہ نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر میرے کالم پڑھنے کے بعد یہ پتہ نہیں چلتا کہ دنیا کا سب سے جھوٹا آدمی کون ہے۔ وہ کہاں ہے اور کس عہدے پر فائز ہے۔ میرے کالم پڑھنے کے بعد لوگ اس بات کا یقین نہیں کر سکتے۔ کہ قلم تلوار سے زیادہ طاقتور ہے یا تلوار قلم سے زیادہ طاقتور ہے۔ لوگ یہ بھی نہیں جان سکتے کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کیوں کھا جاتی ہے۔ میں غالب نہیں اس لیے مجھے اپنے دوستوں سے یہ شکایت نہیں کہ وہ ناصح بن گئے ہیں۔ بہرحال میں نے سوچا ہے کہ چند کالم کام کے لکھوں گا جن کے پڑھنے سے بہت سے قارئین کا بھلا ہوگا۔

سب سے پہلے میں قد بڑھانے کی ترکیب بیان کروں گا عام لوگوں کو یہ شکایت رہتی ہے کہ وہ پستہ قد ہیں اور بھیڑ میں نظر نہیں آتے۔ وہ بیچارے قد بڑھانے کے بازاری نسخے استعمال کرتے ہیں۔ اور پھر ناکام ہو کر یا برباد ہو کر سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ میں ایک ٹھنگنے شخص کو جانتا ہوں جس نے قد بڑھانے کی بازاری گولیاں (بندوق کی نہیں) استعمال کی تھیں۔ وہ گولیاں کھانے سے اس کا قد تو نہ بڑھ سکا لیکن اس کے کان بڑے ہو گئے۔ اور وہ شخص دور سے خرگوش نظر آنے لگا۔ اسی طرح کی بازاری گولیاں استعمال کرنے سے ایک شخص کا قد گھٹ گیا اور اس کی ناک لمبی ہو گئی۔ اور مسلسل بڑھتی چلی گئی۔ کچھ عرصے بعد وہ شخص گنیش نظر آنے لگا (گنیش وہ دیوتا ہوتا ہے جس کی ناک ہاتھی کی سونڈ جیسی ہوتی ہے) وہ بیچارا اگر ہندوستان میں ہوتا (چین و عرب والا) تو پوجا جاتا۔ لیکن پاکستان میں گنیش نما ٹھنگنے شخص کو بڑا گھر والوں کے علاوہ کسی نے گھاس نہیں ڈالی۔ تو صاحبو! بازاری نسخوں سے قد نہیں بڑھتا۔ بلکہ مضر اثرات کی بناء پر ٹھنگنا شخص عجیب الخلقت نظر آنے لگتا ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ لٹکنے سے قد بڑھ جاتا ہے۔ یہ بات کسی حد تک درست ہے۔ ایک ٹھنگنے شخص کو جب پھانسی پر لٹکایا گیا تو اس کا قد پانچ انچ بڑھ گیا۔ لیکن پانچ انچ بڑھا ہوا قد اس کے کام نہ آیا کیونکہ جب اس کو پھانسی سے اتارا گیا تو وہ مر چکا تھا تو صاحبو اس حکایت سے ہمیں یہ نصیحت ملتی ہے کہ قد بڑھانے کے چکر میں آدمی کو کبھی کبھی جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ ایک ٹھنگنا شخص قد بڑھانے کے شوق میں درخت کی ٹہنیوں سے لٹک جاتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ رات کے وقت درخت کی ٹہنی سے لٹکا ہوا تھا۔ اور قد بڑھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لوگوں نے اندھیرے میں اس کو چمگادڑ جانا اور اسے پتھروں اور ڈنڈوں سے پیٹ پیٹ کر مار ڈالا۔ اب میں آپ کو بے ضرر ترکیبیں بتاتا ہوں قد بڑھانے کی۔ آزمایئے۔ یہ نسخے یقیناً باکفایت ہیں۔ (لیکن آپ بارہ چانٹے کے پچ سے ایک سو بیس کپڑے نہیں دھو سکتے)۔

اگر آپ زیادہ ٹھنگنے نہیں ہیں اور خوامخواہ اپنا قد بڑھانے کے چکر میں ہیں۔ تو آپ اونچی ایڑی والا جوتا خرید لیں۔ آپ قد آور نظر آئیں گے۔ پاکستان بھر کے جوتوں کی دکانوں پر جتنے بھی اونچی ایڑی والے جوتے نظر آتے ہیں۔ وہ ٹھنگنے لوگوں کے لیے خاص طور پر بنائے گئے ہیں۔ جوتوں کے اعداد و شمار سے آپ پاکستان میں ٹھنگنے اور پستہ قد لوگوں کے اعداد و شمار کا پتہ چلا سکتے ہیں۔ اگر آپ زیادہ ٹھنگنے ہیں اور بھیڑ میں نظر نہیں آتے تو پھر قد آور نظر آنے کے لیے آپ دو ترکیبیں استعمال کر سکتے ہیں۔ ترکیب نمبر ایک تو یہ ہے کہ آپ اپنے جوتوں کے تلوؤں تلے اچھلنے والے اسپرنگ لگوا لیں۔ اس سے یہ ہوگا کہ آپ جب بھی چلیں گے اچھل اچھل کر چلیں گے اور بھیڑ میں دور سے نظر آتے رہیں گے۔ دوسری ترکیب یہ ہے کہ آپ لکڑی کی ٹانگیں بنوا لیں۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ کتنی لمبی لکڑی کی ٹانگوں پر اپنا توازن برقرار رکھ کر چل سکتے ہیں۔ کچھ لوگ ہم نے ایسے بھی دیکھے ہیں جو سرکس کے مسخروں کی طرح بارہ فٹ لمبی لکڑی کی ٹانگوں پر توازن برقرار رکھ کر چل سکتے ہیں۔ وہ لوگ بھیڑ میں دور سے نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ ایک بے حد پستہ قد خاتون بے حد اونچے سول (تلوے) کا جوتا بنوایا اور وہ بھی قد آور نظر آنے لگیں۔ ریلوے حکام نے ان کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا اور الزام لگایا کہ مذکورہ خاتون نے ریلوے پلیٹ فارم کا ایک حصہ چرا کر اپنے جوتوں کے تلے لگا لیا ہے۔

قد بڑھانے کی تیسری ترکیب یہ ہے کہ آپ اگر ٹھنگنے ہیں تو اپنے قد کے برابر ٹھنگنوں کے درمیان نظر آنے سے اجتناب کریں۔ انسان عام طور پر قد آور تب نظر آتا ہے۔ جب دوسرے لوگ اطراف میں ٹھنگنے اور پستہ قد ہوں۔ لہٰذا آپ ایسے لوگوں کو تلاش کریں جو آپ سے زیادہ ٹھنگنے اور پستہ قد ہوں۔ ایک شخص کے قد و قامت کے بارے میں بہت چرچا تھا۔ اس کو جب دوسرے قد آوروں کی محفل میں مدعو کیا گیا تو وہ بے حد ٹھنگنا اور پستہ قد نظر آیا۔ ایک پستہ قد شخص کے لیے لازمی ہے کہ وہ قد آوروں کی محفل سے گریز کرتا رہے۔ ورنہ بھری طرہ کے پیچ و خم نکلنے سے پہلے ہی درازِ قد کا پردہ چاک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ٹھنگنے آدمی کے لیے بے حد ضروری ہے کہ وہ دوستی بھی ٹھنگنے آدمیوں سے رکھے۔ یہ دنیا عجب سرائے ہے۔ یہاں قدم قدم پر سیر کو سوا سیر اور نہلے کو دہلا ملتا ہے۔ آپ مایوس نہ ہوں (اگر آپ ٹھنگنے ہیں) آپ کو قدم قدم پر اپنے سے زیادہ ٹھنگنے شخص نظر آئیں گے۔ بے حد چھوٹے لوگ مل جائیں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ خوامخواہ دھوکہ نہ کھا جائیں۔ جو شخص آپ کو قد آور نظر آئے اس کا غور سے جائزہ لیجئے۔ بہت سے قد آور لوگوں کے درازیٔ قد کا راز اونچی ایڑی کے جوتوں میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ کچھ بے حد قد آور لوگ جب لکڑی کی بارہ فٹ لمبی ٹانگوں سے نیچے اترتے ہیں تب بے حد چھوٹے اور ٹھنگنے نظر آتے ہیں۔ بس ذرا آنکھیں کھلی رکھئے آپ کو قدم قدم پر ٹھنگنے شخص مل جائیں گے۔

ریشمی رومال تحریک کیا تھی؟ (۱)

ریشمی رومال تحریک

جابرانہ پابندیوں کے خلاف مجاہدانہ اقدام

تحریر: ڈاکٹر احمد حسین کمال

"ریشمی رومال تحریک" کا نام اکثر لوگوں نے سنا ہے لیکن بہت ہی کم لوگ اس "تحریک" کی حقیقت اور تفصیل سے واقف ملیں گے۔ بلکہ یہ کہا جائے کہ گنتی کے چند لوگ ہوں گے جو اس عظیم گم شدہ "تاریخی تحریک" سے حقیقی واقفیت رکھتے ہیں تو بے جا نہیں ہوگا۔

ریشمی رومال تحریک کا نام سب سے پہلے اس وقت منظر عام پر آیا تھا جب رولٹ ایکٹ وائسرائے کی لیجسلیٹو اسمبلی میں پیش ہوا۔ یہ ۱۹۱۶ء کی بات ہے۔ اس موقع پر رولٹ کمیٹی کی رپورٹ بھی شائع ہوئی تھی۔ رولٹ ایکٹ کے ذریعے حکومت ہند کو جو برطانوی حکومت تھی۔ گرفتاری۔ نظر بندی وغیرہ کے لامحدود اختیارات دیئے گئے تھے۔ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں ان اختیارات کے لئے سفارش کی گئی تھی اور اس کی وجوہات ہندوستان میں سازشی تحریکوں کے پھیلے ہوئے جال کے تذکرے کے ساتھ بیان کی گئی تھیں اور اسی بات کو رولٹ ایکٹ کے نفاذ کی وجہ جواز بتایا گیا تھا۔

رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ "عبیداللہ سندھی اور ابوالکلام آزاد نامی دو شر پسند آدمیوں نے بہت سے مسلمان علما کو جن میں سرفہرست دیوبند مدرسہ کے شیخ مولانا محمود الحسن ہیں، ایک باغیانہ سازش اور منصوبہ میں شریک بنایا اور شمالی ہند میں پٹھان قبائل، افغانستان اور بخارا تک اپنے خفیہ بغاوتی مراکز قائم کئے اور مسلح عام بغاوت کی درپردہ تیاریاں جاری رکھیں۔

اس مقصد کے لئے بغاوتی مراکز کے درمیان رابطہ ایک پیغام کے ذریعے ہوتا تھا، جو ریشم کے کپڑے پر کشیدہ کاری کے خفیہ حروف (کوڈ الفاظ) میں لکھ کر بھیجا جاتا تھا۔ حکومت برطانیہ کے کسی جاسوس کو اتفاقیہ ایک ایسا رومال دستیاب ہو گیا جسے بمشکل پڑھا جا سکا اور عام بغاوت کی تاریخ اور وقت سے پہلے اس ہونے والی بغاوت کا انکشاف ہو گیا چنانچہ برطانوی ہند میں واقع تمام مراکز پر اچانک چھاپے مارے گئے اور ان مقامات کے سرکردہ افراد کو گرفتار کر لیا گیا۔

غرضیکہ اسی رپورٹ کی سفارش پر رولٹ ایکٹ نافذ کیا گیا جس کی مخالفت لیجسلیٹو کے بہت سے ہندوستانی ارکان نے کی اور اس سلسلہ میں قائد اعظم محمد علی جناح کی تقریر نہایت اہم تھی تاہم برطانوی حکومت نے ہندوستانی اراکین کی مخالفت کے باوجود رولٹ ایکٹ منظور کرا لیا اور نافذ کر دیا۔ اس ایکٹ کے خلاف ہندوستان گیر مظاہرے ہوئے۔ پنجاب میں ان مظاہروں نے شدت اختیار کر لی، اور جلیانوالہ باغ کا مشہور سانحہ جس میں انگریز فوج نے ہزاروں ہندوستانیوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا تھا، اسی رولٹ ایکٹ کے خلاف مظاہروں کے سلسلہ کا ایک حصہ تھا۔

"ریشمی رومال تحریک" کی تفصیلات رقم کرنے کے لئے میرے سامنے جو مواد ہے، اسے سب سے پہلے بیان کر دوں تو بہتر ہوگا۔

(۱) رولٹ کمیٹی کی رپورٹ۔

(۲) جنرل ایڈوائر (جلیانوالہ باغ امرتسر کا قاتل اعظم) کی کتاب "میں نے ہندوستان کو جیسا کچھ دیکھا"
(AS I SAW INDIA)

(۳) حکومت برطانیہ کا شائع کردہ پچاس سالہ ریکارڈ از ۱۹۰۶ء تا ۱۹۵۶ء

(۴) سی۔ آئی۔ ڈی کی وہ رپورٹیں، جنہیں اپنے دورۂ لندن کے دوران انڈیا آفس سے نقل کر کے جمعیت علمائے ہند کے صدر مولانا اسعد مدنی غالباً ۱۹۷۴ء میں لائے۔ اور ۱۹۷۵ء میں شائع کیں۔

(۵) بعض اکابر مثلاً مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم وغیرہ سے جو اس تحریک میں اصل مردان کار تھے سنے ہوئے واقعات و حالات۔

تقریباً یہ مواد ہے جو میرے پیش نظر رہا ہے اور کچھ ابھی تک پیش نظر ہے۔ اس سے اخذ کر کے میں "ریشمی رومال تحریک" سے متعلق اپنی معروضات پیش کر رہا ہوں۔

ڈائر کی کتاب، رولٹ کمیٹی کی رپورٹ، اور سی آئی ڈی کی رپورٹوں کے ریکارڈ سے تو صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک کا منصوبہ محض تین آدمیوں کی سوچ اور اشتراک کا نتیجہ بنا۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبیداللہ سندھی اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن۔ لیکن جن اکابر سے اس تحریک کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں وہ اسے اس طویل جدوجہد کی کڑی بتاتے تھے جس کا آغاز "صلیبی جنگوں" کے وقت سے ہو گیا تھا۔ یہ جدوجہد علما کے ایک طبقے کی جدوجہد تھی جس میں مسلمان عوام شامل ہوتے رہے۔ "ریشمی رومال تحریک" غالباً اس قسم کی جدوجہد کی آخری کڑی تھی، چنانچہ اس تحریک کے اصل خدوخال نمایاں کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم ماضی کی طرف اتنی دور لوٹ جائیں جہاں سے جدوجہد کا اولین آغاز ہوا۔ اسی طرح مختصراً جائزہ لیتا ہوا "ریشمی رومال تحریک" کی کڑی تک آ پہنچوں۔ صرف اسی طرح ہی اس تحریک کے حقائق کو سمجھا اور جانا جا سکتا ہے۔

صلیبی جنگیں، جو بظاہر مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان مذہبی جنگیں کہلاتی ہیں حقیقت میں یہ مشرق و مغرب کی کشمکش کا نقطۂ آغاز تھا۔ مشرق جس کی نمائندہ قوت مسلمان تھے، مغرب کے حریف اعظم تھے۔ مذہبی اعتبار سے نہیں، بلکہ سیاسی اور معاشی اعتبار سے "گبن" کی کتاب "ڈاؤن فال آف روما" کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ صلیبی جنگوں سے پہلے مشرق سیاسی سماجی، تہذیبی اور معاشی و اقتصادی اعتبار سے کس مقام پر تھا اور مغرب کی اس کے مقابلہ میں کیا حالت تھی۔

اس صورت حال کو بدلنے کے لئے، مغرب کی عیسائی اقوام میں ایک مذہبی جنون پیدا کرنے اور مشرق کی مسلمان طاقت سے ٹکرا جانے کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا تھا۔

صلیبی جنگوں کے لئے آمادہ کرنے کے لئے اس وقت کے عیسائی رہنما، پاپائے روم نے، یورپ کے بادشاہوں کو جو خطوط لکھے ہیں، ان میں یہ موازنہ کیا گیا ہے کہ یورپ کے بادشاہ اور شہنشاہ، مشرق کے مسلمان امرا کے مقابلہ میں کتنے کمتر اور پست معیار کی زندگی بسر کرتے ہیں اور یہ ترغیب یورپ کے عیسائی عوام کو دی گئی تھی کہ وہ مسلمانوں پر حملہ کر کے نہ صرف یسوع مسیح کی خوشنودی حاصل کر لیں گے بلکہ اسی طرح جو مال و متاع ان کے ہاتھ آئے گا اس کے ذریعے وہ بھی مشرق کے مسلمانوں جیسی بلکہ ان سے بہتر زندگی بسر کرنے کے قابل بن جائیں گے۔

اس طرح یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ صلیبی لڑائیاں دراصل اقتصادی اور معاشی لڑائیاں تھیں، جن پر عیسائیت کے فروغ کے جنون کا رنگ پادریوں نے چڑھا دیا تھا۔ ۱۰۹۵ء میں پاپائے روم اربن دوم نے صلیبی جنگ کے آغاز کے لئے سارے یورپ کے عیسائیوں اور بادشاہوں کو پکارا اور مسلمانوں پر بالفاظ دیگر مشرق پر حملہ آور ہونے کی ترغیب دی۔ اربن دوم کے وہ تمام خطوط شائع ہو چکے ہیں جو اس نے یورپ کے بادشاہوں کو لکھے تھے اور اس کے وہ مذہبی خطبات بھی شائع ہو گئے ہیں جو اس نے صلیبی جنگ شروع کرنے کے لئے مختلف اجتماعات میں دیئے تھے۔

۱۱۸۷ء میں جب صلاح الدین ایوبی نے یروشلم دوبارہ فتح کر لیا تو صلیبی جنگوں کا دور ختم ہو گیا۔

تقریباً دو سو سال کی ان جنگوں کی تفصیل میں جائے بغیر اس کے جو نتائج سامنے آئے وہ آئندہ رفتہ رفتہ مشرق کی کمزوری اور زوال اور مغرب میں عیسائیت سے بغاوت، اور انحراف کے ساتھ یورپی استعمار کی نئی ٹنگ ودو کی صورت میں نکلے۔ اس مرحلہ پر عالم اسلام میں جو اب بے شمار سلطنتوں میں بٹ گیا تھا اور خطرہ تھا کہ سیاسی موت کا شکار ہو جائے علما کی تحریکوں کا آغاز ہوتا ہے۔

انہوں نے حکمرانوں کی مغرب دوستی اور عوام دشمنی کے خلاف احتجاج کیا

علما کا ایک طبقہ یہ سمجھنے لگا تھا کہ یورپ کی استعماری صلیبی قوت اب اپنے پیر مختلف راستوں اور حیلوں کے ذریعہ پورے مشرق میں پھیلانا شروع کرے گی۔ امام ابن تیمیہ رح اس سلسلہ کے پہلے شخص ہیں جنہوں نے صلیبی جنگوں اور تاتاری یورشوں کے بعد مسلمان حکمرانوں سے علیحدہ اسلامی عوامی تحریک کی بنیاد رکھی۔

امام ابن تیمیہ رح ۱۲۶۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۳۲۸ء میں فوت ہوئے۔ سلطان مصر نے انہیں ان کی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے ۱۳۰۵ء میں گرفتار کر لیا تھا دو سال بعد رہا کیا۔ لیکن ۱۳۲۵ء میں پھر اسیر بنا لیا اور آپ نے قید خانہ میں ہی وفات پائی۔ اسلام کے حوالہ سے امام ابن تیمیہ رح نے تین سو کے قریب کتابیں لکھیں۔ اور مسلمان عوام کو تاتاریوں کی یورشوں کا مقابلہ کرنے کے لئے منظم کرتے رہے۔ انہوں نے شخصیت پرستی کے خلاف زبردست جہاد کیا اور اس بنا پر وہ وقت کے حکمرانوں کے معتوب بنے اس طرح انہوں نے علما کی ایک ایسی تحریک کا آغاز کر دیا جو جابرانہ نظام

جب اظہار کے ذرائع مسدود ہوئے تو رومال کے ذریعے پیغام رسانی کی گئی

کے خلاف جہاد کرتے اور مسلمان عوام کو اپنے ساتھ شامل رکھنے پر مشتمل تھی۔ مغربی مصنفین نے تو امام ابن تیمیہ کی تحریک اور کارناموں کو عرب قومیت کے احیا کی کوششوں سے تعبیر کیا ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ امام موصوف نے علما پر زور دیا تھا کہ وہ عوام کو اپنے ساتھ ملائیں اور جبر و ظلم کا مقابلہ کریں۔ نیز یورپ کے فتنے سے خبردار رہیں۔

امام ابن تیمیہؒ کے وقت سے ہم دیکھتے ہیں کہ ہر جگہ علما کا ایک طبقہ اپنے اپنے علاقے کے حکمرانوں کے غیر اسلامی اور عوام دشمن رویے کے خلاف باقاعدہ احتجاج کرتا رہا ہے اور مقابلتاً ایسی تنظیمیں بنا رہا ہے جو غریب عوام کی یک جہتی باہمی تعاون، ایک دوسرے کی خدمت اور ایثار و مساوات کے پروگرام کی حامل تھیں

اس صورت حال کی تفصیل میں جانا بہت زیادہ طوالت کا موجب بن جائے گا، لیکن اگر ہم اٹھارویں اور انیسویں صدی کے مسلم علاقوں کا جائزہ لیں تو ہمیں ہر جگہ عالم اسلام میں، علما کی برپا کردہ عوامی تحریکوں اور تنظیموں کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً نجد میں محمد بن عبدالوہاب کی وہابی تنظیم و تحریک جس کے نتیجے میں آپ کو سعودی عرب کی موجودہ سلطنت نظر آ رہی ہے۔ طرابلس کی سنوسی تحریک جس نے مراکش سے لیبیا تک مسلمان عوام کی جدوجہد کا صور پھونکا اور آج وہاں آزادی و انقلاب کی عوامی تحریکیں نشوونما پا رہی ہیں، الجزائر کی عبدالقادر تحریک حریت جس نے پورے فرانس کو ہلا دیا تھا۔ آج الجزائر اس جدوجہد کے طفیل آزادی سے ہمکنار ہو! سوڈان کی مہدی درویش تحریک جس نے انگریزوں کا براہ راست مقابلہ کیا۔ مصر کی مفتی عبدہ کی تحریک جس نے مغربی سامراج کے خلاف وہاں کے مسلمان عوام کو صف آرا کیا۔ افغانستان، ایران اور ترکی میں جمال الدین افغانی کی تحریک جس نے انقلاب کا بیج بویا اور عوام کو نئی تبدیلیوں کے لئے آمادہ کیا۔

یہ تمام تحریکیں بظاہر جدا جدا اور ایک دوسرے سے بے تعلق نظر آتی ہیں، لیکن ان کے کردار کی یکسانیت اور ان کے مقاصد کی ہم آہنگی یہ ثابت کرتی ہے کہ ان کے درمیان کچھ نہ کچھ مشترک چیز ضرور رہی ہے یہ مشترک چیز مغربی استعمار کے خلاف نفرت اور اپنے اپنے حکمرانوں کی مغرب دوستی اور عوام دشمنی کے خلاف احتجاج ہے، جو ہر تحریک میں نمایاں نظر آتا ہے۔

برصغیر میں بھی علما کے ایک طبقے کا یہ کردار اور جدوجہد عہد اکبری سے بھی بہت پہلے سے ہمیں ملتا ہے سید محمد جونپوری کی تحریک جو لودھی حکمرانوں کے ظلم و جبر کے خلاف احتجاج کے ساتھ ساتھ غریب مسلمان عوام میں مساوات حتیٰ کہ معاشی مساوات تک کی حامل تھی۔ اسی طرح عہد اکبری میں مجدد صاحب کی تحریک و تنظیم، تاہم شاہ ولی اللہ نے اپنے افکار و تعلیم سے ایک ایسی ہمہ گیر انقلابی تحریک کی اساس رکھی جس کا تجزیہ ابھی تک پوری طرح نہیں کیا گیا ہے، تاہم جس کا اعتراف ہر مورخ نے کیا ہے۔

"ریشمی رومال تحریک" دراصل اس ولی اللہی تحریک اور جدوجہد کا ہی آخری باب تھا جو ایک مکمل فکری نظام، عملی پروگرام اور انقلاب آفریں جدوجہد پر مشتمل ہے۔

ان تمام تحریکوں کے بنیادی نکات یہ تھے۔

(۱) توحید کی تعلیم۔

(۲) انسانی مساوات (عبدیت الٰہی) کی تعلیم۔

(۳) جماعتی اعتبار سے باہمی اخوت کی تعلیم جس میں معاشی یکسانیت تک شامل تھی۔

(۴) وقت کے حکمرانوں کے جبر و استبداد کے خلاف جدوجہد اور ان سے بے تعلقی۔

(۵) اجتہاد و اجماع امت۔

(۶) فرنگ (اس سے مراد اس وقت کا پورا یورپی استعمار ہے) کے خلاف محاذ آرائی۔

شاہ ولی اللہ کی فکر اور تحریک نے اس میں یہ اضافہ کیا کہ۔

(۷) ایک صالح اور اجتماعی قیادت کی تشکیل۔

(۸) تمام سابق اور مروج نظام ہائے زندگی کا خاتمہ اور اس کی جگہ ایک نئے عالم گیر اور انسانی اخوت و مساوات پر مبنی نظام کا قیام جو ہر قسم کے استحصال سے پاک ہو۔

(۹) مسلمانوں میں تمام فرقہ بندیوں کا خاتمہ۔

(۱۰) ہمسایہ غیر مسلم اقوام کے ساتھ مساویانہ حُسن سلوک اور اشتراک۔

سامراج دشمن تحریکیں، ایک پلیٹ فارم پر

مولانا عبیداللہ سندھی، ۲۴ سال کی جلاوطنی کے بعد، ۷ مارچ ۱۹۳۹ء کو کراچی پہنچے۔ اور اسی دن لوگوں سے خطاب کیا۔ اُن کی تقریر ہم سید اصغر علی شاہ ناظم نشر و اشاعت جمعیت طلبا اسلام صوبہ سندھ کے شکریہ کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ مولانا سندھی نے اس تقریر میں کہا تھا کہ اگر میری موت کے تین سال کے بعد بھی انگریز برصغیر سے نہیں گیا تو میری قبر پر آ کر گلہ کرنا، مولانا ۱۹۴۴ء میں فوت ہوئے۔ اور تین سال کے بعد یعنی ۱۹۴۷ء میں برصغیر آزاد ہو گیا۔ اور مولانا کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی —————— (ادارہ)

جھونپڑی سے اٹھنے والا انقلاب محل کو پیوستِ زمیں کر دیتا ہے' عبیداللہ سندھی

عزیزان گرامی۔

۱۹۱۵ء میں مجھے حضرت شیخ الہند نے افغانستان بھیجا تھا۔ آپ کے بزرگوں نے مجھے باہر بھیجا تھا۔ باہر رہ کر جو کچھ اسلام کی خدمت کر سکتا تھا میں نے کی۔ میرے سامنے پہاڑ آئے شکست کھا گئے۔ موت آئی شکست کھا گئی۔ میں ان سپاہیوں کا رفیق رہا جنہوں نے دنیا کے بڑے بڑے معرکے سر کیے۔ آپ میری باتوں کو، غربت اور عارضی ہیجانات کا نتیجہ نہ سمجھئے گا۔

میرے پیچھے تجربات کی ایک وسیع دنیا ہے۔ میں آپ سے کوئی بات پوچھنا نہیں چاہتا۔ میرے افکار وقف عام ہیں۔ اب میں چراغ سحری ہوں چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے اس پیغام کو ہندوستان کے نوجوانوں تک پہنچا دوں۔ اگر یہی حالات رہے تو مجھے خطرہ ہے کہ بنگال کی تقسیم نہ ہو جائے۔ پہلے پہل اس انقلاب کی لپیٹ میں افغانستان آئے گا۔

میں انقلاب کا پیغامبر بن کر ہندوستان لوٹا ہوں۔ وہ دن دور نہیں کہ برطانیہ اور امریکہ والوں کو اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ اس انقلاب کو قیامت سے کم نہ سمجھیے گا۔ میں نے بڑے بڑے علماء کو بڑے بڑے افراد کو دربدر بھیک مانگتے دیکھا ہے۔ عزتوں کو بکتے دیکھا ہے۔ یہ عالمگیر انقلاب ہے۔ ایک نہ ایک دن ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے کر رہے گا۔ دیوار چین ہو یا سد سکندری! یہ سب کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا۔ دنیا ایک طوفان نوحؑ سے دوچار ہوا چاہتی ہے۔ بادل گھر چکے ہیں۔ گھٹائیں برسنے کو ہیں۔ ہمارے علماء ہیں کہ ان کی نظریں کتابوں تک محدود ہیں۔ وہ باہر کی دنیا کو دیکھنا نہیں چاہتے۔ ہمارے سیاستدان بڑی بڑی سکیمیں بناتے ہیں جو اغراض مصالح پر مبنی ہوتی ہیں۔ عوام کو انتہائی نچلے درجے میں رکھ چھوڑا ہے۔ قرآن حق ہے، انجیل حق ہے۔ تورات حق ہے۔ انجیل کو غلط رنگ میں پیش کرنے سے یہودی کافر ہو سکتا ہے تو اس ملک کے مسلمان قرآن غلط رنگ میں پیش کرتے سے کیسے مسلمان رہ سکتے ہیں۔ اب انقلاب کی گھڑی قریب آ چکی ہے۔ سن لو ورنہ مٹا دیئے جاؤ گے!

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ کل ایک طبقہ قوت و جبال کا مالک تھا۔ کسان اور مزدور جو کماتے تھے ان کو کھانے کو نہ ملتا تھا۔ جو ان کی کمائی پر پلتا وہ کمانا ذلت کا نشان سمجھتا۔ کاؤ طبقے پسماندہ اور کھاؤ طبقے اخلاق سے گر گئے۔ اگر برکتیں پھیلتیں تو سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے محلوں میں ذہن کی جلا رہوتی تو ان کو ہوتی۔ زمانہ مدتوں چلتا رہا۔ سرمایہ دار مزدوروں اور کسانوں پر ظلم ڈھاتے رہے۔ اس دور میں مشینی دور آتا ہے۔ آگے چل کر مزدوروں نے مشینوں پر قبضہ کر لیا۔ جاگیردارانہ نظام ختم ہو گیا۔

آج اس کا نعرہ ہے "مزدورو! اور کسانو! اٹھو بڑی بڑی بلڈنگیں، بڑے بڑے محلات تمہاری کمائی سے وجود میں آئے ہیں۔ اس پر قبضہ کر لو۔ جو اس کے آڑے آئے انہیں مٹا دو"۔

اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو ایسے فلسفے کو قبول کرو جس کی ترجمانی امام ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے۔ اگر تمہارے امراء نے غرباء کی خیر خواہی نہ کی تو تمہارا وہ حشر ہو گا جو بخارا کے مسلمانوں کا ہو چکا ہے۔ بخارا کے اندر ایک ایک مدرسہ عربی کی یونیورسٹی تھی۔ ترکی کی جو سیاسی طاقت ہے آپ کے ملک کی وہ سیاسی طاقت نہیں۔ جس انقلاب کے سامنے بخارا کی مذہبیت نہ ٹھہری۔ ترکی کی سیاست نہ ٹھہری اس کے سامنے تم کیسے ٹھہر سکتے ہو؟ جب غریب کی جھونپڑی سے انقلاب اٹھتا ہے تو وہ امیر کے محل کو بھی پیوست زمین کر کے جاتا ہے"۔

اگر میں مر گیا اور میرے مرنے کے تین سال بعد انگریز ہندوستان سے نہ گیا تو میری قبر پر آ کر کہنا کہ انگریز یہاں آ کر بیٹھا ہوا ہے۔ میں قبر سے جواب دوں گا۔ میں نے انگریز کی بیخ و بنیاد کو اکھیڑ دیا ہے۔ اب وہ ہندوستان میں نہیں رہ سکتا ہے۔ عنقریب تم مجھے یاد کرو گے۔ میں اپنے معاملے کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔

شاہ ولی اللہ کی فکر و تحریک سے آگے چل کر ایک باقاعدہ جماعت کی تشکیل کی اور یہی جماعت علماء تھی جس کے جانشینوں نے بنگال سے پشاور تک اور مدراس سے سندھ تک ایک ایسی جدوجہد کا آغاز کیا جس کا اعلانیہ اور خفیہ سلسلہ "ریشمی رومال تحریک" تک جاری رہا اور بعد میں اس کا خاتمہ "خلافت تحریک" پر ہوا جس کے بطن سے آزاد ہندوستان اور آزاد پاکستان کی تحریکوں نے جنم لیا۔

شاہ ولی اللہ کا دور برصغیر ہندوستان ہی نہیں بلکہ پورے مشرق میں شکست و ریخت اور مغربی قوتوں کے بڑھتے ہوئے ابتلا کا دور تھا۔

شاہ ولی اللہ ۱۷۰۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۷۶۲ء میں فوت ہوئے۔ یہ ساٹھ سال دنیا کی تاریخ کے اہم ترین سال ہیں۔ انہیں سالوں میں یعنی اٹھارویں صدی کے نصف اول میں یورپ میں لوتھر کی تحریک اصلاح کی بدولت مذہبی رجعت پرستی سے عوامی انحراف برپا ہوا۔ لبرلزم کی لہر پیدا ہوئی۔ یورپ میں جاگیرداری کا خاتمہ ہوا۔ جمہوری تحریکوں کا آغاز ہوا۔ جدید فلسفہ اور سائنس کی بنیاد پڑی۔ انقلابی تنظیمیں بننے لگیں۔ صنعتی اور سرمایہ داری کے عہد نے جنم لیا۔ بورژوازی نظام نے جگہ لے لی۔ پرولتاریت کی نمود شروع ہوئی۔ یورپ کی برسر اقتدار قوتیں، ترقی کے جدید ہتھیاروں کے ساتھ مشرقی ملکوں کی طرف یلغار کرنے لگیں اور ان علاقوں کو اپنی استعماری لوٹ کھسوٹ اور اپنے سیاسی عزائم کا شکار بنانے پر تل گئیں۔

ہندوستان پر اس وقت تین مغربی طاقتوں نے اپنی تگ و دو جاری رکھی ہوئی تھی۔ ایک فرانس، دوسرے پرتگال اور تیسرے انگریز۔ ہندوستان کی مغل حکومت اور اس کے گماشتے زوال کے آخری مراحل سے گزر رہے تھے۔ مقامی چھوٹے چھوٹے حکمران۔ مغرب کی آئی ہوئی ان طاقتوں کے ساتھ گٹھ جوڑ میں شریک ہو رہے تھے۔ شمال کی طرف سے نادری اور ابدالی حملوں نے حکومت دہلی کی کمر توڑ ڈالی تھی۔ ہندوستان کے ان حالات کے پس منظر میں شاہ ولی اللہ کی تحریک نے اپنی جدوجہد کے لئے میدان بنانا شروع کیا۔

فکری نظام، عملی پروگرام اور انقلاب آفریں جدوجہد میں فتح بدل جاتی ہے

یہ تحریک کئی حصوں میں تقسیم ہوئی۔

شاہ ولی اللہ کی وفات کے بعد ان کے تابعین اور شاگردوں نے جو ہندوستان کے تمام اطراف میں پھیل گئے تھے اور ہندوستان سے باہر افغانستان تاشقند، کاشغر، بخارا اور ترکستان تک پھیلے ہوئے تھے اپنی اپنی جگہ تحریک و تنظیم کا کام، ان اصولوں پر جاری رکھا جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

ان کوششوں کے نتیجہ میں بنگال، دکن، سندھ و بلوچستان، شمالی پختون علاقہ، وسط ہند اور دہلی و پنجاب میں مساجد و مکاتب کو مراکز بنا کر، غیر ملکی حکمرانوں اور مقامی استحصال کنندگان کے خلاف غریب مسلمان عوام کو جن میں اکثریت کسانوں اور حرفت پیشہ افراد کی تھی، منظم کیا جانے لگا اور اس تنظیم میں غریب ہندو آبادی بھی شامل ہوتی چلی گئی۔ دکن میں تحریک

شریعت' بنگال میں تحریک فرائضی، سندھ اور بلوچستان
میں تحریک حُر، پٹھان قبائلی علاقوں میں تحریک جہاد کے
بانیان شاہ ولی اللہؒ کے ناتیین ہی تھے۔ وسط ہند، دہلی
اور پنجاب میں اس تحریک کی تنظیم شاہ اسماعیل شہید
اور مولانا سید احمد بریلوی نے کی۔

ان تحریکوں کے تفصیلی حالات لکھنے کا یہ موقع
نہیں ہے بتانا صرف یہ مقصود ہے کہ امام ابن تیمیہؒ
کے وقت سے علماء کے ایک طبقے نے عوامی جدوجہد کا جو
سلسلہ شروع کیا اور برّصغیر ہندوستان میں شاہ
ولی اللہؒ نے جس سلسلۂ کار کی بنیاد ڈالی۔ اس نے
پورے مشرق اور مسلم دنیا میں جگہ جگہ عوامی جدوجہد
کی طرح ڈال دی اور مختلف علاقوں میں مختلف ناموں
سے ولی اللہی تحریک کے مقاصد پورے کرنے کے لئے
علماء کے طبقے مصروف کار ہو گئے۔ ان تحریکوں کی مشترکہ
خصوصیت یہ تھی کہ

(۱) ان کی تنظیم عوام پر مشتمل تھی۔

(۲) ان کا تنظیمی معاشرہ مکمل مساوات پر مبنی
ہوتا تھا۔

(۳) ان کا عملی پروگرام عوام کی بے لوث خدمت
سے شروع ہوتا تھا۔

(۴) ان کی جدوجہد کا رُخ غیر ملکی طاقتوں کی طرف
رہتا تھا۔

سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید کی تحریک
جہاد کے بارے میں بعض لوگوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ
وہ پنجاب کی سکھ حکومت کے خلاف تھی جو بہرحال ایک
مقامی طاقت تھی اور اس کے کمزور پڑ جانے سے انگریزوں
کی طاقت کو فائدہ پہنچا حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے
پنجاب کی سکھ حکومت جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی شاہی
میں قائم تھی، اس کی سرپرستی ہندوستان میں موجود
فرانسیسی قوت کر رہی تھی۔ راجہ کی فوج کی تربیت فرانسیسی
فوجی کرتے تھے۔ اور اس وقت ہندوستان میں مغرب
کی یہ دونوں طاقتیں، انگریز اور فرانسیسی ایک دوسرے
کے رقیب کی صورت میں برّصغیر پر اثر انداز ہو
رہی تھیں۔

ولی اللہی تحریک کے مقاصد میں ہر مغربی قوت
کا استیصال شامل تھا۔ چنانچہ سید احمد شہید اور
مولانا اسماعیل شہید کا سکھ حکومت کے خلاف جہاد
بالواسطہ فرانسیسی اثرات کے خلاف جہاد تھا حتیٰ کہ
سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید کو آخری بار
سکھوں کی جس فوج نے شکست پر مجبور کیا اس کا
سپریم کمانڈر ایک فرانسیسی جنرل تھا۔

ہندوستان کے مغرب میں جب سید صاحب
کا سر گرم تھا، مشرق میں (بنگال اور آسام)
نثار علی عرف تیتو میاں نے کسانوں کی بغاوت کا
علم بلند کر رکھا تھا۔

سر ولیم ہنٹر نے اپنی کتاب (OUR INDIAN MUSLIMS)
"ہمارے ہندوستانی مسلمان" میں لکھا ہے کہ "۱۸۳۰ء میں
جب مجاہدین سرحد نے پشاور پر قبضہ کر لیا تو تیتو میاں اس
قدر دلیر ہو گیا کہ اس نے اپنا مذہبی نقاب اتار پھینکا۔
اور کسانوں کی پُرجوش بغاوت کا سرغنہ بن بیٹھا۔ اس
کے بعد کسانوں کی بہت سی بغاوتیں ہوئیں جس کے نتیجہ
میں باغیوں نے اپنے آپ کو ایک مورچہ بند کیمپ میں
محفوظ کر لیا"۔

بالاکوٹ میں سید احمد شہید کی جدوجہد کا خاتمہ
ہو گیا لیکن ولی اللہی تحریک جاری رہی۔ جگہ جگہ چھوٹی
بڑی جھڑپیں ہوتی رہیں۔ جہاد کا مرکز، قبائلی علاقوں میں
منتقل کر دیا گیا اور ملک بھر میں ایک عام بغاوت کی
تیاریاں شروع کر دی گئیں۔

۱۸۵۷ء کا مسلح انقلاب آزادی کے حصول کی
ایک عام کوشش تھی، جس کی قیادت مدراس سے سرحد
تک اور بنگال سے بلوچستان تک، علماء کا وہی طبقہ کر
رہا تھا جو شاہ ولی اللہؒ کی فکر اور تحریک کا پیدا کردہ تھا۔

۱۸۵۷ء میں انگریزوں کو کامیابی حاصل ہوئی
پورا ہندوستان برطانوی حکومت کے تسلط میں چلا گیا۔
لیکن سرحدی علاقہ سے انگریزوں کے خلاف جہاد
جاری رہا اور انگریزوں کو کئی فوجی مہمات اس علاقے میں
بھیجنی پڑیں جو ہمیشہ ناکام لوٹیں۔

۱۸۵۷ء سے ۱۹۰۰ء تک برطانیہ نے مصر اور
سوڈان تک اپنی سلطنت کا دائرہ بڑھا لیا اور اطالیہ و
فرانس نے افریقہ کے ملکوں کے مسلمان حصوں پر اپنے
پنجے گاڑ دیئے۔ انڈونیشیا پر ہالینڈ والے قابض ہو گئے
اس کے باوجود پوری مسلم دنیا اور مشرق میں ولی اللہی
تحریک کے مبلغ موجود تھے۔ جو اگرچہ میدان جنگ سے
پسپا ہو چکے تھے لیکن ولی اللہی انقلاب کی تعلیمات
سے بہرہ ور تھے اور انہیں اب تک اپنا نصب العین بنائے
ہوئے تھے اسی منتشر شیرازے کو یکجا کر کے مغربی طاقتوں
بالخصوص انگریزوں کے خلاف ایک ہمہ گیر خفیہ جدوجہد
میں تبدیل کرنے کا خیال، دیوبند کے ایک عالم دین مولانا
محمود الحسن کو آیا ان کے اس منصوبہ کے اولین شرکاء
مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبید اللہ سندھی تھے۔

منصوبہ یہ تھا کہ ہندوستان، افغانستان، وسط ایشیا
اور شمالی افریقہ و عربستان میں پھیلی ہوئی مغربی سامراج
کی مخالف تحریکوں کو یکجا کیا جائے اور ایک مرکز کے
تحت لا کر کسی مناسب موقع پر اندر و باہر سے، دنیا کی
سب سے بڑی سامراجی سلطنت، برطانیہ عظمیٰ پر ایسا وار
کیا جائے کہ اس کا خاتمہ ہو جائے۔

اس مقصد کے لئے کیا کیا کیا گیا۔ اس کی کہانی
تو بہت طویل ہے لیکن برطانوی جاسوسوں نے اپنی حکومت
کو جو اطلاعات فراہم کیں اور جن کی اساس پر رولٹ
کمیٹی نے رپورٹ مرتب کر کے رولٹ ایکٹ نافذ کرنے
کی سفارش کی، اس کا وہ حصہ میں یہاں نقل کر رہا
ہوں جس سے معلوم ہو جائے گا کہ "ریشمی رومال تحریک"
کیا تھی۔

باقی آئندہ

بقیہ : امروز

ختم کرنے کا یہ فارمولا دیانت کر چکے ہیں اور اس کی
تشہیر بھی کرتے ہیں کہ ہمارے ملک میں عریاں اور جرائم سے
بھر پور فلموں، فلمی پرچوں، اور اسی قماش کی دیگر "عیاشیوں" کو
بند کر دیا جائے تو جرائم از خود ختم ہو جائیں گے۔ یہ فارمولا
درست ہے یا غلط اس پر تو وہی لوگ کچھ کہہ سکتے ہیں
جو استحصالی نظام معیشت کو جرائم کی ماں تصور نہیں کرتے
بہرحال ان سماج سدھار ٹھیکیداروں کو بھی آج کل کے اخبارات
دیکھ دیکھ کر حال بُرا ہوگا۔ یا یوں کہئے کہ "حال بُرا" کرنے
کی اداکاری کر رہے ہوں گے کیونکہ ان افراد کا شمار ان
بچانوے فیصد سیاسی خبروں سے لذت حاصل کرنے
والے افراد میں نہیں ہوتا۔

بات چونکہ روزنامہ امروز کے "رنگ بدلنے
والے حوالے سے چلی تھی اس لئے ہم یہاں یہ کہنے پر کچھ مجبور سے
ہیں کہ پریس ٹرسٹ والوں کو امروز کا رنگ تبدیل کرتے
وقت پتہ نہیں کیوں روزنامہ "مشرق" کی لوح کا سرخ رنگ
نظر نہیں آیا۔ انہیں اپنی اس غلطی کو فوراً محسوس کرتے
ہوئے بغیر کسی حیل و حجت کے مشرق کی لوح کو نیلا کر دینا
چاہیئے تاکہ مشرق کی "مارکیٹ ویلیو" امروز کی
"مارکیٹ ویلیو" سے پیچھے یکم نہ رہے۔
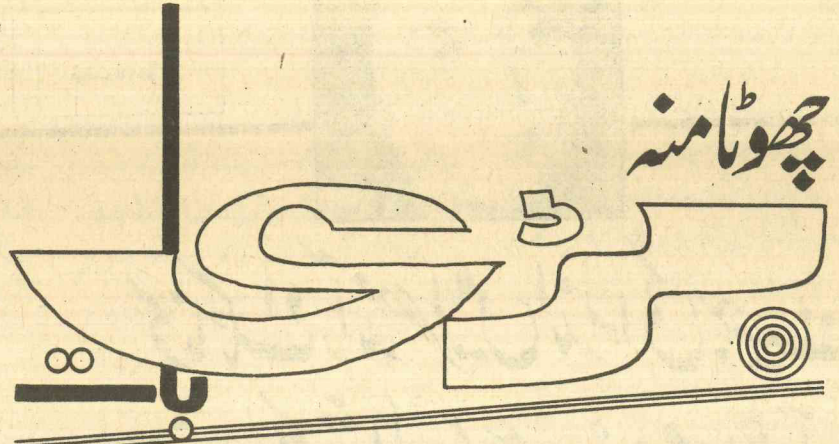
دہلی کے جریدے "شبستان اردو ڈائجسٹ" نے اپنے اگست ۶۸ء کے شمارے میں شری مرار جی ڈیسائی کا انٹرویو چھاپا تھا جب وہ بھارت کے نائب وزیر اعظم تھے۔ جریدہ کے "ملاقاتی" نے انہیں بتایا کہ وہ اس سے پہلے پروفیسر بلراج مدھوک اٹل بہاری باجپائی اور شیخ عبداللہ کے انٹرویو لے چکا ہے "ملاقاتی" لکھتا ہے "مرار جی ڈیسائی اب تک مسکرا رہے تھے لیکن یہ تینوں نام سنتے ہی ان کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ ان کے تیور بدل گئے۔ آنکھوں کا انداز بدل گیا۔ انہوں نے کہا "مطلب یہ کہ آپ غلط آدمیوں سے بھی انٹرویو لیتے رہے ہیں"۔

وقت، موسم اور حادثے اکثر غلط لوگوں کو صحیح اور صحیح لوگوں کو غلط بنا دیتے ہیں۔ حادثہ گذرا تو جنتا حکومت میں وزیر اعظم مرار جی ڈیسائی نے وزارت خارجہ کا بھاری بھرکم قلمدان شری اٹل بہاری باجپائی کے سپرد کر دیا۔ وقت کی بات کہ ایک دوسرے کے نزدیک غلط آدمی جناب انور سادات اور محترم بیگن ایک موڑ پر ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے اور موسم کی ستم ظریفی یہ کہ پاکستان میں اسلامی شیر اور غیر اسلامی بکریاں ایک گھاٹ پانی پینے لگے۔

کرشن چندر نے اپنے ۵۴ء کے ایک افسانے "بھومی دان" میں لکھا ہے۔ "دنیا کا ہر پیشہ ور ریٹائر ہو جاتا ہے مگر لیڈر کبھی ریٹائر نہیں ہوتا"۔ مشاہدہ ہے کہ اگر کوئی نسمہ پالیٹیشن کے کسی حصے میں لیلائے حکومت کو اپنے عقد میں لاتے میں کامیاب رہتا ہے۔ تو اپنے ہمعصر سیاستدانوں کو ریٹائر کر دیتا ہے اور اگر وصل محبوب سے ناشاد رہتا ہے تو مسند نشیں کو ریٹائر ہونے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اگر دونوں حالتوں سے محروم رہتا ہے تو اولاد میں لیڈر یا گھر سے باہر چیلے چانٹے پیدا کرتا ہے جو باپ کے مشن یا گروہ کے آدرش کو زندگی بھر تن من اور پرائے دھن سے پورا کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ سیاسی اسٹیج پر نت نئے سوانگ رچانے، ناٹک کھیلنے اور بلا ٹکٹ رام لیلائیں دکھاتے رہتے ہیں۔

ناٹک کے تذکرے سے یاد آیا کہ سابق بھارت ورش میں ناٹک لکھنے کا سہرا مہاکوی کالیداس کے سر بندھتا ہے جس کا مقولہ ہے۔ "پھلوں کے بوجھ سے پیڑ، پانی کے بوجھ سے بادل اور دولت کے بوجھ سے شریف آدمی جھک جاتے ہیں"۔ بزرگوں کے مقولوں کی طرح یہ مقولہ بھی سو فی صد درست ہے اور کراچی سے پشاور تک ہر قسم کے پھلوں سے لدے پھندے درخت ہر سو بکھرے پڑے ہیں۔ بادل گھن گرج کے ساتھ ٹوٹ ٹوٹ کر چھاجوں پانی برسا رہے ہیں۔ اور کمر خمیدہ شریف آدمی چھوڑ گام گام پر اپنی شرافت کے پمفلٹ بانٹ رہے ہیں۔ چار لافانی نظموں ـــ میگھ دوت، رگھونش، کمار سمبھو اور رت سمہار کے خالق کالیداس جی نے تین عظیم ناٹک ورثے میں چھوڑے ہیں ـــ ابھگیان شاکنتم (شکنتلا) وکرم اُرویشیم اور مالویکا گنی متر۔ ان دنوں موخر الذکر ناٹک بھارت، پاکستان سری لنکا اور اس قبیل کے خطوں میں کھڑکی توڑ رش کے ساتھ کھیلا جا رہا ہے لیکن افسوس کہ ناٹک کے تخلیق کار کا وجود ہنوز ابہام کا شکار رہے۔ کہیں لکھا ہے کہ وہ پہلی صدی عیسوی میں سمراٹ وکرما دتیہ کے نورتنوں میں تھا اور کہیں اسے دو تین صدی قبل مسیح کا شاعر بتایا جاتا ہے۔ میکس ملر اور دیگر تیسری صدی لکھا اور "بھوج پربندھ" کا مصنف سین گیارھویں صدی میں راجہ بھوج پرمار کا درباری بتاتا ہے۔ اسی لیے آج کل کھیلے جانے والے ناٹکوں میں زیادہ زور "ویلن" کے لطیفے اور اس کی شہرت پر دیا جا رہا ہے۔

اطلاعات کے مطابق مسلم لیگ کے قد آور اور پی این اے کے بلند و بالا لیڈر جناب چوہدری ظہور الٰہی میٹرک لیٹ کہلانے کی جدوجہد کر رہے ہیں اور اس سال امتحان میں موصوف کا رول نمبر ۱۶۵۳۰ ہے۔ سیاسی امتحانات کی طرح اکتسابی امتحان میں ان کی کامیابی یقینی ہے کیونکہ ۱۶۵۳۰ کا مفرد ۶ ہے اور موصوف کے نام کا عدد بھی (منفی چوہدری کہ علم اعداد میں چودھراہٹ نہیں چلتی) ۶ ہے۔ اس ہندسے کا موکل معمولی سی کوشش سے اچھی کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ روپے پیسے کے معاملات میں خوش قسمت ہوتا ہے اور وعدہ کر کے فی الفور بدل جاتا ہے۔ ماہرین علم اعداد کے مطابق اگر کوئی شخص جاننا چاہے کہ وہ کسی مقابلے میں اپنے مدمقابل کو پچھاڑ دے گا یا نہیں۔ تو وہ اپنے نام کے حروف میں ۶ کا ہندسہ جمع کر کے مفرد نکالے۔ دونوں میں جو عدد بڑا ہو گا۔ وہ کامیاب ہو گا ہر قسم کے مقابلے کے لیے ہندسہ چھ والے نوٹ فرمالیں۔

کراچی میں "پروفیسروں" کی کمی نہیں ہے۔ ایک نور محل ہوٹل صدر والے پروفیسر کوکب ہیں جو تقدیر کو تدبیر سے بدلنے کے داعی ہیں۔ ایک ایمپرس مارکیٹ صدر کے عقب میں پروفیسر اجمیری ہیں جو مایوسی کو راحت میں بدل دینے کے ذمہ دار ہیں۔ تین ہٹی پل کے پاس پروفیسر بخاری پتھر دل اور سرکش محبوب کو آپ کا مطیع بنا سکتے ہیں۔ چڑیا گھر کے قریب پروفیسر بھٹی آپ کی ہر خواہش پوری کرانے کے منتظر ہیں۔ ان سب سے بالاتر ایک "پروفیسر" ایسے عملیات جانتے ہیں کہ اس سرزمین کو جنت بنا دیں گے اور کوئی پاکستانی قیامت کے بعد بھی اسے کہ جنت میں جانے کا تصور بھی نہ کر سکے گا۔ (حسن بن صباح کی کی جنت نہ لے بیٹھئے) موصوف اپنے عملیات اور تعویذات کے اشتہار گزشتہ فروری سے ملک بھر میں تقسیم کر رہے ہیں۔ ان کی پاک دامنی شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ مصنفانہ زبان استعمال کرتے اور شیریں گفتار ہیں۔ قارئین بوقت حاجت ان سے رجوع کر سکتے ہیں۔ پتہ اس لیے نہیں دیا جا رہا ہے کہ بچہ بچہ ان کی "پروفیسری" سے آگاہ ہے

کرناٹک اور آندھرا میں اندرا کی جیت
جنوب کا شمال پر عدمِ اعتماد

جنتا پارٹی اقتصادی صورتحال بہتر کرنے میں ناکام ہو گئی

بھارت کے وزیر خارجہ مسٹر اٹل بہاری باجپائی کے دورۂ پاکستان کے موقع پر ان کے ساتھ آنے والے صحافی کراچی بھی آئے تھے اور کراچی پریس کلب میں مقامی صحافیوں سے ملاقات کی تھی۔ اس ملاقات میں تقریباً ہر بھارتی صحافی سے سابق بھارتی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے مستقبل کے بارے میں پوچھا گیا تھا۔ ان تمام بھارتی صحافیوں نے الفاظ کے فرق کے ساتھ یہی جواب دیا تھا کہ ۲۵ فروری ۷۸ء کو ہونے والے انتخابات کے نتائج سے ہی حقیقی صورتحال سامنے آئے گی۔

اس الجھی ہوئی صورتحال کا پس منظر مختصراً یہ تھا ۱۹۷۵ء تک مسز اندرا گاندھی کی پچھلے عام انتخابات میں حاصل کردہ مقبولیت میں کمی واقع ہو گئی تھی۔ اقتصادی عدم استحکام کے نتیجے میں بے روزگاری اور بہتر حالات کار کے لیے نجی اور سرکاری شعبوں کے ملازمین کی جدوجہد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس صورتحال سے مخالف پارٹیاں فائدہ اٹھا رہی تھیں۔ مسز گاندھی کی مقبولیت کو سب سے زیادہ نقصان نس بندی کی مہم سے پہنچا اور ان کا راج سنگھاسن ڈانواں ڈول ہونے لگا۔ اسی دوران بھارت کے ایک ہائی کورٹ نے انتخابات میں ناجائز حربے استعمال کرنے کی بنیاد پر مسز اندرا گاندھی کے انتخابات کو کالعدم قرار دے دیا۔ بعد میں سپریم کورٹ نے اس فیصلے کو منسوخ کر دیا لیکن دونوں فیصلوں کے درمیانی عرصے میں حزب اختلاف کی جماعتوں نے مسز اندرا گاندھی کو مستعفی ہونے پر مجبور کرنے کے لیے زبردست مہم چلائی۔ مختصراً یہ کہ مذکورہ بالا اور بعض دوسرے حالات نے اندرا جی پر اتنا دباؤ ڈالا کہ انہوں نے اپنے تمام دعووں اور جمہوریت کے پرچار کے باوجود ملک پر ہنگامی حالات مسلط کر دیئے۔ ہنگامی حالات کے دوران جو غیر جمہوری کارروائیاں کی گئیں۔ ان کی تفصیلات شاہ کمیشن کی تحقیقات میں سامنے آ رہی ہیں۔ ویسے بھی ۷۷ء کے انتخابات کے دوران حزب اختلاف نے جنتا پارٹی کی صورت میں متحدہ محاذ (جو بعد میں ایک جماعت کی شکل اختیار کر گیا) قائم کر کے ہنگامی حالات کے دوران اندرا حکومت کی جمہوریت دشمن کارروائیوں ہی کو اپنی انتخابی مہم کی بنیاد بنایا تھا۔ عوام نے اس کا کیا اثر قبول کیا۔ وہ انتخابات کے نتائج سے ظاہر ہے۔ اس طرح تیس سال بعد کانگریس مرکز میں نہ صرف اقتدار سے محروم ہو گئی بلکہ مجموعی اعتبار سے اور خود مسز اندرا گاندھی کی شکست کی صورت میں اسے ایک شرمناک شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کے بعد اندرا حکومت اور خاص طور سے سنجے گاندھی کے خلاف جو مہم شروع ہوئی اس سے عام تاثر یہی بنتا تھا کہ پنڈت موتی لال نہرو کی پوتی۔ جواہر لال نہرو کی بیٹی اور ان کی سیاسی وارث کا مستقبل تاریک ہو گیا ہے۔

اندرا گاندھی نے اس صورتحال کا جرأت سے مقابلہ کیا۔ فراخ دلی کے ساتھ اپنی اور اپنی جماعت کی شکست تسلیم کی لیکن ان کی یہ جرأت اور فراخ دلی اقتدار سے محرومی کے دور میں پارٹی پر ان کی گرفت مضبوط نہ رکھ سکی۔ انہیں وقتی طور پر پس منظر میں جانا پڑا۔ لیکن بعد کے حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرگرم عملی سیاست سے دور رہ کر مسز اندرا گاندھی نے اپنا وقت صرف گیان دھیان گرو سے اشیرباد لینے ہی میں صرف نہیں کیا بلکہ اپنی شخصیت اور سیاست کے جادو سے نکل بھاگنے والوں کو سمیٹنے اور اپنی بکھری ہوئی طاقت کو اکٹھا کرنے کی بھی کوشش کرتی رہیں۔ اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ تقریباً نوے برس تک ایک متحدہ جماعت کی حیثیت سے قائم رہنے والی جماعت دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئی۔ برہمانند ریڈی کی قیادت میں کام کرنے والا دھڑا سرکاری کانگریس کہلایا اور نیا گٹھ کانگریس (آئی) یعنی اندرا کانگریس پکارا جانے لگا۔

اس پس منظر میں جزوی عام انتخابات میں تین بڑے فریق میدان میں اترے۔ جنتا پارٹی کے پاس اقتدار بھی تھا اور ۷۷ء میں حاصل کردہ عوامی حمایت بھی۔ جمہوریت کی بحالی کے لیے کیے جانے والے اقدامات کی سرخروئی بھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک منفی پہلو یہ تھا کہ جنتا پارٹی ملک کی اقتصادی صورتحال میں کوئی بنیادی اور بہتر تبدیلی لانے میں ناکام رہی تھی۔ بین الاقوامی سطح پر اس وقار اور آزادیٔ عمل کو برقرار نہ رکھا جا سکا۔ جو کانگریس نے ورثے میں چھوڑا تھا۔ دوسرے فریق سرکاری کانگریس کے پاس خود کو پارٹی کا اصلی اور جائز وارث ثابت کرنے کی ناکام کوشش کے علاوہ کوئی قابل ذکر اور پرکشش پروگرام نہیں تھا۔ برہمانند ریڈی۔ وائی بی چوان اور سردار سورن سنگھ اور ان جیسے بہت

سے مل کر بھی اندرا گاندھی کی شخصیت اور سیاسی کشش کی ہمسری نہ کر سکے۔ اندرا گاندھی کی کانگریس کے پاس اندرا گاندھی کی شخصیت کے ساتھ ساتھ جنتا حکومت کی ناکامیاں اور خامیاں تھیں۔ سرکاری کانگریس کی مجہولیت اور سب سے بڑی بات جنوبی صوبوں کی مخصوص سیاسی فضا اور شمال پر عدم اعتماد تھا۔

حالیہ انتخابات کے نتائج ہر اعتبار سے خلافِ توقع رہے ہیں۔ مبصرین کی رائے میں کرناٹکا، پردیش اور آندھرا پردیش میں اندرا کانگریس کی کامیابی یقینی تھی لیکن کسی کو بھی یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ کامیابی اتنی بھرپور، اتنی قطعی ہو سکتی ہے نہ ہی یہ اندازہ تھا کہ سرکاری کانگریس کو اتنی شرمناک شکست سے دوچار ہونا پڑے گا۔ مہاراشٹر پردیش میں بھی اندرا کانگریس نے سارے اندازے غلط ثابت کیے اور ۲۸۸ کے ایوان میں حکمران جنتا پارٹی کی ۹۸ اور سرکاری کانگریس کی ۶۹ نشستوں کے مقابلے میں ۶۲ نشستیں حاصل کر کے یہاں بھی اپنی طاقت اور مقبولیت کا ثبوت پیش کر دیا۔ بھارت کے موجودہ صدر شری سنجیوا ریڈی کی خالی کردہ لوک سبھا کی نشست پر اندرا کانگریس کے امیدوار کی کامیابی نے اس سیاسی گروہ کی مقبولیت میں اور اضافہ کیا ہے۔

مہاراشٹر میں کسی بھی جماعت کو اکثریت حاصل نہیں ہے۔ کانگریس کے دونوں دھڑے مل کر بھی ۱۴۵ کی لازمی تعداد نہیں بنتے۔ لیکن ان کی تعداد جنتا پارٹی کی ۹۸ کے مقابلے میں ۱۳۱ بنتی ہے۔ دونوں متحد ہو کر سب سے بڑی جماعت بنتے ہیں اور بجا طور پر حکومت بنانے کے حقدار ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں بشرطیکہ جنتا پارٹی کے علاوہ دوسری پارٹیوں اور آزاد اراکین کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو جائیں۔ اسی امکان کے پیشِ نظر اتحاد کے لیے مذاکرات ہو رہے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ جب آپ یہ سطور پڑھ رہے ہوں یہ اتحاد عملی صورت اختیار کر چکا ہو۔ اگر ایسا ہوتا ہے تو یہ بھارتی سیاست میں دور رس نتائج کا حامل ہو گا۔ اس سے نہ صرف جنتا پارٹی کے لیے ایک بڑا مسئلہ کھڑا ہو جائے گا بلکہ بھارتی سیاست میں دلچسپی اور مفادات رکھنے والی عالمی طاقتوں میں مسابقت بھی تیز ہو جائے گی۔

حالات آئندہ کیا صورت اختیار کرتے ہیں اس سے قطع نظر نقطۂ نظر جو بات سامنے آتی ہے یہ ہے کہ مسز اندرا گاندھی ایک بار پھر بھارت جیسے وسیع و عریض ملک کی سب سے زیادہ طاقتور، مؤثر اور مقبول سیاسی رہنما کی حیثیت میں ابھری ہیں۔ ان کا یہ اعلان کہ وہ آئندہ نہ تو ملک کی وزیر اعظم بننے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ نہ ہی انتخابات میں حصہ لینے کا۔ اگر انہوں نے اپنے اس اعلان پر عمل کیا تو نہ صرف ان کی مقبولیت میں اضافہ ہو گا اور ان کے پچھلے گناہ کسی حد تک دھل جائیں گے۔ بلکہ مہاتما گاندھی اور ج پرکاش نراین کی قائم کردہ روایت آگے بڑھ سکتی ہے۔

حالیہ جزوی انتخابات کے نتائج بذاتِ خود بھارتی سیاست میں کوئی بڑی تبدیلی تو نہیں لا سکتے لیکن اپنے اثر کے اعتبار سے بھارت کو سیاسی الجھاؤ اور لامرکزیت سے نکال کر نئی سیاسی صف بندیوں کا سبب ضرور بنیں گے۔ سیاسی صف بندیوں میں صرف شخصیات اور مخالف جماعتوں اور افراد کے خلاف منفی پروپیگنڈہ ہی کافی نہیں ہوتا۔ بلکہ مثبت سماجی اور اقتصادی پروگرام بھی وضع کرنے پڑتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں سیاسی محاذ آرائی کی سطح بلند اور وسیع ہو گی۔ اس اعتبار سے یہ نتائج صرف اندرا گاندھی کے لیے ہی نہیں بلکہ بھارتی سیاست کے لیے بھی خوشگوار اثرات کے حامل قرار دیے جا سکتے ہیں ●●

ڈیسائی

ایتھوپیا اور صومالیہ میں

مصالحت کرائیں گے

باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ سوویت یونین کے صدر برزنیف اور امریکہ کے صدر جمی کارٹر نے بھارتی وزیر اعظم شری مرارجی ڈیسائی سے رجوع کیا ہے کہ وہ ایتھوپیا اور صومالیہ کے مابین صلح کرانے کے لیے اپنا ذاتی اثر و رسوخ استعمال کریں۔ بتایا جاتا ہے کہ مسٹر ڈیسائی نے "مڈل مین" کا کردار ادا کرنے پر رضامندی کا اظہار کر دیا ہے۔

وقت وقت کی بات ہے ایک زمانہ تھا کہ پاکستان سے استدعا کی جاتی تھی کہ وہ بین الاقوامی تنازعوں میں ثالث کا کردار ادا کرے۔ پاکستان مصالحت کراتا تھا امریکہ کی درخواست پر پاکستان نے امریکہ اور چین میں اختلافات دور کرانے میں تاریخی کردار ادا کیا۔ پھر وائٹ ہاؤس نے پاکستان سے استدعا کی کہ وہ شمالی کوریا اور امریکہ کے درمیان رابطے کا فریضہ انجام دے۔ چنانچہ اس وقت کے وزیر اعظم پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو نے شمالی کوریا کا دورہ کیا۔ پھر قبرص کے تنازعے میں ترکی اور قبرص دونوں نے ہی پاکستان سے "رابطے" کا کردار ادا کرنے کی درخواست کی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اس زمانے میں پاکستان دوطرفہ تعلقات کے اصول پر گامزن تھا۔ وہ عالمی تنازعات میں فریق نہیں بنتا تھا غیر جانبدار رہتا تھا۔ لیکن اب پاکستان نے ایتھوپیا اور صومالیہ کے "تنازعہ میں" ایک فریق یعنی صومالیہ کی حمایت کر کے اپنا غیر جانبدارانہ کردار کھو دیا ہے اسی لیے اب سوویت یونین اور امریکہ دونوں ہی بھارت کے ذریعے مصالحت کرانا چاہتے ہیں ●

امارات میں 5000 ہزار

پاکستانی اور بھارتی بے روزگار ہیں

انسانوں کی مزید درآمد روکنے کا فیصلہ

محسن بخاری

پاکستانی مصنوعات کی بجائے انسانوں کی برآمد سے زرمبادلہ کمارہا ہے

باخبر ذرائع نے متحدہ عرب امارتوں سے اطلاع دی ہے کہ مختلف ریاستوں دبئی، بحرین قطر وغیرہ میں پچاس ہزار پاکستانی اور ہندوستانی باشندے اس وقت بے روزگار ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگ حال ہی میں بے روزگار کیے گئے ہیں۔ یہ بھی پتہ چلا ہے کہ اس صورتحال پر غور کرنے کے لئے متحدہ عرب امارتوں کے سربراہوں کا اجلاس ہوا ہے جس میں انسانوں کی مزید درآمد روک دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

بحر ہند کی ان ریاستوں میں مزدوروں کی تعداد ضرورت سے بہت زیادہ ہونے کی وجہ سے وہاں پر مزدوروں کی یومیہ اجرت کم ہوتے ہوتے تقریباً نصف رہ گئی ہے۔ جس سے اس وقت وہاں موجود پاکستانی مزدور انتہائی پریشان ہیں انتہائی سخت کام - غذا کی کمی، مناسب رہائش نہ ہونے کی وجہ سے پہلے ہی ان لوگوں کی صحتیں دگرگوں تھیں۔ اس وجہ سے اس وقت صرف سعودی عرب اور لیبیا کے لئے آدمی بھرتی کیے جا رہے ہیں۔

یوں تو قیام پاکستان کے کچھ عرصہ بعد ہی لوگ روزگار کی تلاش میں ملک سے باہر جانا شروع ہو گئے تھے۔ لیکن ان کی تعداد محدود تھی۔ اور ان کا رخ برطانیہ اور یورپی ممالک کی جانب تھا جب، مختلف عرب ممالک میں تعمیراتی کام شروع ہوا تو ان ممالک کو جانے والے لوگوں کی لمبی قطاریں لگ گئیں۔ اور پچھلے دو تین سال میں اتنے بڑے پیمانے پر لوگ ان ریاستوں کو بھیجے گئے۔ جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ اور اس سارے عمل کو حکومت کی پشت پناہی بلکہ حوصلہ افزائی ملی اس سے پاکستان کو دو طرح سے اقتصادی سہارا ملا ایک طرف تو اندرون ملک بے روزگاری کا دباؤ کم ہوا دوسری جانب باہر جانے والے لوگوں کی بچتوں کی صورت میں زرمبادلہ پاکستان آنے لگا جو بڑھتے بڑھتے پاکستان کی تمام برآمدات سے بھی زیادہ ہو گیا اس طرح جہاں دوسرے ممالک اپنی مصنوعات بیچ کر زرمبادلہ کماتے ہیں وہاں پاکستان انسانوں کی برآمد سے زرمبادلہ کی ضرورت پوری کر رہا ہے ملک بدر کر دینا یا جلاوطنی ایک ایسی سزا تھی جو نہایت سنگین جرائم پر مجرموں کو دی جاتی تھی۔ آج کل وطن عزیز سے محنت کشوں کا ترک وطن کر کے غیر ممالک میں روزگار کی تلاش میں چلے جانے کا چرچا عام ہے اس سلسلے میں ایک علیحدہ وزارت بھی کام کر رہی ہے اور یوں اس رضاکارانہ جلاوطنی کو حکومت کی سرپرستی اور امداد حاصل ہے۔ آیئے ذرا دیکھیں کہ یہ ہولناک سزا محنت کش اپنے لیے خود کیوں تجویز کر لیتے ہیں۔ اور یہ عمل درحقیقت سزا کیوں اور کیسے ہے۔ اس موضوع پر غور کرنے سے پہلے روزنامہ "نوائے وقت" لاہور کے مورخہ ۲۶ مارچ ۱۹۷۷ء کی ایک خبر ملاحظہ ہو۔ جس کی سرخی ہے "سعودی عرب میں ہڑتال کرنے والے پاکستانیوں کو رہا کرانے کے بعد پاکستان بلا لیا گیا۔ پوری خبر یہ ہے۔

"اسلام آباد - ۲۲ مارچ، مذہبی امور اقلیتی امور اور سمندر پار پاکستانیوں کے لیے وفاقی وزارت کے جوائنٹ سیکرٹری مسٹر شریف الحق نے ایک وضاحتی بیان میں فرمایا ہے کہ سعودی عرب کی حکومت نے ہوخ ٹیف نامی جرمن فرم میں کام کرنے والے چند پاکستانی مزدوروں کو اس وجہ سے گرفتار کر لیا تھا کہ انہوں نے فرم میں ہڑتال کر دی تھی جبکہ ہڑتال سعودی عرب میں قانوناً جرم ہے انہوں نے کہا کہ ان پاکستانیوں کی گرفتاری کی اطلاع ملنے پر وفاقی وزیر مولانا کوثر نیازی نے سعودی عرب میں پاکستانی سفارتخانے سے معلومات طلب کیں اور پاکستانی سفارتخانے کی کوششوں کے نتیجے میں ان پاکستانیوں کو رہا کرا دیا گیا۔ اور انہیں واپس پاکستان بھجوا دیا گیا۔"

سب سے پہلے جو سوال ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ ملک سے باہر کون لوگ جاتے ہیں۔ کیوں جاتے ہیں اور کیسے جاتے ہیں سرمایہ داری نظام میں سرمایہ دار اور اس کے حواری کاروبار یا سیر و تفریح یا تعلیم کی غرض سے بیرون ملک جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس طبقے کی حکومت کے لوٹے کے افراد وفود یا تربیت وغیرہ کے پروگراموں کے سلسلے میں بھی ملک سے باہر جاتے ہیں۔ یہ لوگ نہایت عیش و آرام سے ہوائی جہازوں میں سفر کرتے ہیں مہنگے ہوٹلوں میں ٹھہرتے ہیں۔ اور زندگی کی ہر آسائش سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہ اپنی مرضی سے چند دن یا چند ماہ کے لیئے جاتے ہیں۔ اور جب دل بھر جاتا ہے تو پھر وطن کا رخ کرتے ہیں۔ اس کے برعکس محنت کش زندگی کی ناگزیر ضروریات کی تلاش میں دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہوتا ہے وہ بھوک، افلاس اور بے روزگاری سے تنگ آکر تلاش معاش میں اپنے لیئے جلاوطنی کی سزا قبول کرتا ہے اس کو اگر اپنے ملک میں ہی روزگار مل جائے تو وہ کبھی بھی اپنے گھر والوں بیوی بچوں، ساتھیوں، دوستوں کو چھوڑ کر تنہا ایک ایسے غیر ملک میں نہ جائے جہاں وہ زبان تک سے واقف نہ ہو۔ جہاں بیماری میں کوئی پوچھنے والا نہ ہو۔ جہاں اپنے گھر والوں کے دکھ درد مصیبت تکلیف میں شریک ہونے تک سے وہ مجبور اور بے بس ہو۔ جب کوئی شخص اپنے ماں باپ بیوی بچوں کے ساتھ رہتا ہے تو وہ صرف پیسہ ہی کما کر نہیں لاتا۔ بلکہ ہزار اور طریقوں سے اپنے گھر بار کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ ایسے ایک شخص کا گھر سے ہزاروں میل دور چلے جانا اس شخص کے لئے اس کے گھر والوں کے لیئے اور بالآخر اس معاشرے اور ملک کے لیئے انتہائی سنگین نتائج پیدا کرتا ہے۔

میرا سوال تھا کہ ملک سے باہر کون لوگ جاتے ہیں، کیوں جاتے ہیں اور کیسے جاتے ہیں اس سوال کا تیسرا حصہ رہ گیا ہے اور شاید یہی سب سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ باہر جانا آسان کام نہیں اور جتنا پیسہ باہر جانے پر خرچ ہوتا ہے اگر اتنا پیسہ کوئی شخص آرام سے پیدا کر سکتا ہو۔ تو شاید اسے باہر جانے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو۔ اس سلسلے میں نہ صرف وفاقی وزارت کام کر رہی ہے بلکہ انسانوں کی برآمد کو ایک باقاعدہ کاروبار کا درجہ دیدیا گیا ہے۔ اور مختلف ایجنسیاں باقاعدہ اور باضابطہ طور پر حکومت کی جانب سے منظور شدہ کاروباری اداروں کے طور پر کام کر رہی ہیں ان ایجنسیوں کا کام ہے مناسب لوگ اکٹھے کرنا ان سے بھاری رقوم وصول کرنا اور ان رقوم کے عوض ویزا وغیرہ جیسی ضروری کارروائی کر کے ان لوگوں کو باہر بھیجنے کا بندوبست کرنا جلاوطنی ہونے کی فیس پانچ ہزار سے لیکر پندرہ ہزار تک ہوتی ہے اس ضمن میں ناجائز اور غیر قانونی کاروبار بھی عروج پر ہے اور کئی بھولے بھالے محنت کش بری طرح سے لوٹے جاتے ہیں یہ رقم کس طرح قرض لے کر جمع کی جاتی ہے اس سلسلہ میں کیا کیا بیچنا پڑتا ہے تھوڑی بہت جمع پونجی کا کیا انجام ہوتا ہے۔ یہ تو وہی بتا سکتا ہے جس نے باہر جانے کے لیئے رقم اس طرح جمع کی ہو۔ یا کوشش کے باوجود جمع نہ کر سکا ہو۔

اگر پہلا مرحلہ حل ہو بھی گیا اور کوئی شخص تلاش روزگار میں ملک سے باہر جانے میں کامیاب بھی ہو گیا تو باہر اس پر کیا بیتی ہے ملک سے باہر جانے والے ہر شخص کی انتہائی شدید خواہش یہ ہوتی ہے کہ کم سے کم مدت میں

زیادہ سے زیادہ رقم اپنے منتظر گھر والوں کو بھیجے۔ اس مضمون میں یہ جاننے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ "فاضل" رقم کس زبردست نقصان کے بدلے حاصل کی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں جو سب سے پہلی چیز نظر کے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ملک بدر ہونے والے "تارکین وطن" صرف سرمایہ دار ممالک کی جانب ہی کوچ کرتے ہیں۔

سرمایہ داری تو نام ہی اس نظام کا ہے جس میں انسان کے ہاتھوں انسان کا استحصال شدید ترین صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ملکی استحصال کی نسبت بیرون ملک جا کر ایک تارک وطن کا معاشی، سماجی، ذہنی اور نفسیاتی استحصال اور بھی زیادہ شدت اختیار کر لیتا ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ ماسوائے سوشلسٹ ممالک کے پوری تیسری دنیا کے بے روزگار اس کوشش میں رہتے ہیں کہ کسی طرح وہ کسی ترقی یافتہ سرمایہ دار ملک میں یا کسی ایسے ترقی پذیر سرمایہ دار ملک میں پہنچ جائیں جہاں سرمایہ داری کا فروغ پورے عروج پر ہو۔ (مثال کے طور پر آج کل مشرق وسطیٰ وغیرہ) سرمایہ دار ملک سے بھی لوگ ترک وطن کرتے ہیں لیکن یہ غریب ممالک میں مشیر اور اعلیٰ افسر عہدیدار بنتے ہیں اور یوں ان ملکوں کو نہ صرف مزید لوٹتے ہیں بلکہ اپنا معیار زندگی اپنے ملک کی نسبت کئی گنا بڑھا لیتے ہیں۔ ترک وطن کا یہ سلسلہ افریقہ ایشیا، لاطینی امریکہ کے ہر ملک سے جاری ہے کیونکہ ان ممالک کے حالات ایک سے ہیں۔ اور اور سرمایہ داری نظام چاہے امریکہ میں ہو، مغربی یورپ میں ہو یا مشرق وسطیٰ میں، ایک ہے۔

ہر ملک کے قوانین اس ملک کے حکمران طبقات کے مفاد کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قانون وہی بنایا جاتا ہے جو حکمرانوں کو فائدہ پہنچائے اور ان کی حکومت کو مزید مضبوط بنائے ہجرت کے قوانین بھی اصول کے تحت کام کرتے ہیں۔ انسانوں کو برآمد کرنے اور درآمد کرنے والے ممالک کے قوانین کا اگر بغور جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ اگر ایک جانب قانون کا مقصد لوگوں کی برآمد کو آسان بنانا ہے۔ تو دوسری طرف درآمد کنندہ ملک ان قوانین کو اتنا سخت بناتا ہے کہ درآمد کو پوری طرح سے قابو میں رکھا جا سکے اور بوقت ضرورت ناپسندیدہ اشخاص کو باآسانی ملک سے نکالا جا سکے۔ لوگوں کو اپنے ملک کے قوانین سے ہی واقفیت نہیں ہوتی۔ غیر ملک میں جا کر وہاں کے قوانین جاننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ویسے بھی یہ تمام کے تمام قوانین باہر سے آنیوالے لوگوں کے حق میں نہیں ہوتے۔ اول تو باہر سے آنے والے کو ہر وقت واپس بھیج دیئے جانے کا خطرہ ہوتا ہے اور یہ خطرہ اس کے لیئے دوہرے عذاب کی صورت اختیار کرتا ہے کیونکہ ایک تو واپس جا کر پھر بے روزگاری کا سامنا ہوگا۔ اور دوسرے یہ کہ اکثر بیشتر باہر جانے والا بھاری قرضے لے کر آیا ہوتا ہے اور واپس جا کر ان کی ادائیگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا یہی وہ بنیادی وجہ ہے کہ وہ اس ملک کے محنت کش طبقے کی جدوجہد میں بھی حصّہ نہیں لے سکتا اور اس سے کنارہ کش رہتا ہے۔ وہ کسی تنظیم یا یونین کا رکن بننے سے گھبراتا ہے۔ اور یوں اس ملک کے محنت کش ساتھیوں سے بھی الگ تھلگ رہتا ہے اس کے علاوہ یہاں سے جانے والے ویسے بھی اس ملک کے محنت کشوں کی نسبت کم اجرت پر کام کر کے وہاں کے مزدوروں کی سودا کاری کی طاقت کو کم کرتے ہیں اور یوں آپس کے تضاد کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس طرح سے حکمران طبقے کو دو فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ اول کم اجرت پر مزدور اور دوسرے ان مزدوروں کی آپس کی لڑائی جو انہیں ایک ہو کر سرمایہ دار سے لڑنے کے قابل ہونے سے روکتی ہے۔

درآمد کنندہ ممالک کے قوانین اور بھی کئی طریقوں سے باہر جانے والے محنت کش کے شدید استحصال میں معاون ہوتے ہیں مثال کے طور پر ان ممالک میں غیر ملکیوں کو زمین، مکان وغیرہ خریدنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ انہیں قانونی طور پر پنشن، بونس، سوشل سکورٹی، سماجی بہبود اور دوا جیسی بنیادی ضرورتوں سے محروم رکھا جاتا ہے۔ اکثر اوقات ان لوگوں کو نہ صرف ملک میں زیادہ دیر نہیں رہنے دیا جاتا۔ بلکہ انہیں نوکری سے بھی جلدی فارغ کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ پنشن وغیرہ جیسی سہولتوں کے حقدار ہی نہ بن سکیں آپ نے غور کیا ہوگا کہ زیادہ تر لوگوں کو معاہدوں کے تحت ایک خاص میعاد کے لیئے ہی ملک میں کام کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ بعض مرتبہ باہر سے آنے والا محنت کش غیر سرکاری اور غیر قانونی طور پر بلا اجازت کام کرتا ہے یہ بھی درآمد کنندہ ملک کے حکمران طبقات کی ملی بھگت ہوتی ہے اور قانون کے "محافظ" جان بوجھ کر خاموش رہتے ہیں۔ اس گٹھ جوڑ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ غیر ملکی دیگر ان فلاحی ممالک کے قوانین کے تحفظ اور مختلف سماجی بہبود بہم پہنچانے والے اداروں سے ملنے والی امداد سے محروم رہیں مزید یہ کہ کاغذات میں اجرتیں کچھ ہوتی ہیں اور دراصل کچھ اور۔ شکایت کر نہیں سکتے۔ فریاد کریں تو کس سے۔ ظالم سرمایہ دار اس ذریعے سے دوگنا منافع کماتا ہے ایک طرف اس غریب کی روزی کا حصّہ مارتے تھے اور وہ بھی اس روزی کا جو "پوری" بھی جائز حق سے کم ہوتی ہے۔ اور دوسری جانب "قانونی" طور پر ٹیکس وغیرہ سے چھوٹ حاصل کر لیتے ہیں

آخر میں برآمد کنندہ ملک کے لئے اس سارے عمل کی سماجی قیمت یا نقصان کا ایک سرسری سا جائزہ لیں ہم نے دیکھا ہے کہ اس عمل کا کم از کم تین طرفہ اثر ہے۔ فرد۔ خاندان اور ملک۔ سب سے پہلے فرد کو لیں وہ سب رشتہ داروں اور دوستوں سے کٹ کر ایک اجنبی ملک میں پہنچ جاتا ہے جہاں وہ اپنے ساتھ کام کرنے والے کی زبان تک نہیں سمجھ سکتا۔ زبان کے علاوہ اگر رنگ کی بھی تفریق ہو جیسے کہ عرب ممالک میں ہوتا ہے نسل کی تفریق ہو تو اسے اکثر کمتر سمجھا جاتا جاتا ہے۔ اور اس کی وقعت اچھوت اور ادنیٰ درجہ کے انسان کی ہوتی ہے۔ اُسے ہزار طریقے سے تنگ کیا جاتا ہے اور قدم قدم پر اسے شدید احساس کمتری کا سامنا کرنا پڑتا ہے مثلاً اسے ہر جگہ یعنی دکان، ہوٹل، بس سینما کلب، ڈاکٹر غرض انسانی زندگی کے ہر شعبے میں غیریت اور کم مائیگی کا زبردست احساس دلایا جاتا ہے ذہنی طور پر وہ ہمیشہ مسافر بنا رہتا ہے۔ نہ اس کے قدم جمتے ہیں اور نہ ہی وہ اپنی جڑیں بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر یہ سب کچھ نہ بھی ہو رہا ہو تب بھی ہر شخص جلدی سے جلدی اپنی ضرورت، مجبوری پوری کر کے واپس اپنے ملک اور اپنے لوگوں میں پہنچنا چاہتا ہے مزید یہ کہ وہاں کی زندگی کے مادی حالات بھی اتنے حسین نہیں ہوتے جتنے یہاں سے نظر آتے ہیں۔ باہر کے ممالک جانے والوں کا رہن سہن تعلیم، دوستی آرام آسائش اور کام کی نوعیت اوقات سب کچھ ہی انتہائی تکلیف دہ ہوتا ہے ان لوگوں کو کسی قسم کی تفریح میسر نہیں ہوتی۔ فلم جو کہ عموماً سب سے سستی تفریح تصور کی جاتی ہے بھی ان کے مقدر میں کبھی کبھی ہی آتی ہے کیونکہ ان کا مقصد تو زیادہ سے زیادہ کمانا اور کم سے کم خرچ کرنا ہوتا ہے تاکہ جلدی بچت کر سکیں۔ اور واپس وطن کو لوٹیں یہ چاہتے ہیں کہ گھر پر منتظر بیوی بچوں کو زیادہ سے زیادہ پیسے بھیج سکیں۔ ویسے یہ بھی حقیقت ہے کہ یہاں سے تنخواہیں وغیرہ بہت زیادہ معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن درحقیقت مصارف زندگی کی قیمت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ وہاں بھی بچت اپنا پیٹ کاٹ کر ہی ممکن ہوتی ہے۔

مشرق وسطیٰ میں زندگی بالکل فوجی کیمپوں کی طرح ہے یہاں سے جانے والے سخت عذاب میں بستیوں، آبادیوں شہروں سے میلوں دور کیمپوں میں رہتے ہیں جہاں سے ان کو ہفتہ میں ایک روز تین یا چار گھنٹوں کے لیئے شہر لایا جاتا ہے غرض زندگی بالکل قیدیوں کی سی ہے۔

جانے والا تو ہر حال چلا جاتا ہے اب دیکھیں کہ پیچھے رہ جانے والوں پر کیا بیتتی ہے یہ لوگ ایک خاوند، بیٹے، باپ بھائی سے محروم ہوئے۔ بیوی بچے سرپرستی اور شفقت سے محروم ہوئے اور اس محرومی کے کیا کیا نتائج مرتب ہوتے ہیں یا ہو سکتے ہیں۔ بیان کرنے کے لئے ایک علیحدہ مضمون تحریر کیا جا سکتا ہے۔ کئی مرتبہ اولاد بے راہ روی کا شکار ہو جاتی ہے کیونکہ ماں کی ممتا باپ کی شفقت بھری سختی کی جگہ نہیں لے سکتی۔ بسا اوقات پورا خاندان ہجرت کر جاتا ہے لیکن ایسی صورت میں بعد میں پیش آنے والے مسائل اور بھی دشوار ہوتے ہیں اول تو بچوں کی تعلیم و تربیت کا مسئلہ عذاب جان بنا رہتا ہے اور بالآخر بچوں کی شادی بیاہ کے مسائل ان لوگوں کو بے چینی اور اضطراب کی حالت میں واپس ملک میں لے آتے ہیں۔ وطن واپس آنے پر بھی ان کی پریشانی بآسانی حل نہیں ہوتی اور یوں یہ بدقسمت لوگ شدید بحران کا شکار رہتے ہیں۔

ایک نظر ملک کے نقصان پر بھی ہو جائے ملکی وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک بچے کو پال پوس کر بڑا کیا جاتا ہے جب تک وہ خود کام کاج کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔ اس وقت تک وطن عزیز کا ہر دہقان اس کے لیئے روٹی پیدا کرتا ہے۔ اور ہر مزدور اس کا تن ڈھانپنے کے لیئے کپڑا تیار کرتا ہے جب یہ احسان عظیم چکانے کا وقت آتا ہے تو بے روزگاری اس کو اپنی جوانی کا سرمایہ غیر ملکیوں کی خدمت میں کم اجرت پر لٹانے پر مجبور کر دیتی ہے ملک دو توانا بازوؤں سے محروم ہو گیا۔ اور اگر بیرون ملک جانے والا محنت کش کسی فن میں بھی ماہر ہے تو یہ نقصان کئی گنا زیادہ ہوتا ہے آپ دیکھیں گے کہ بیرونی ممالک میں صرف صحت مند نوجوانوں کو ہی بلایا جاتا ہے۔ صرف ایسے ہی جوانوں کو کام فراہم کیا جاتا ہے جو کام کر سکیں۔ نہ صرف صحت و توانائی پر زور ہوتا ہے بلکہ نام وغیرہ لکھنا پڑھنا بھی جاننا اکثر ضروری ہوتا ہے جس ملک میں خواندگی کی شرح صرف اٹھارہ فیصد ہے۔ وہاں یہ بھی ایک عظیم ناقابل تلافی نقصان ہوتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے واضح ثبوت وہ اشتہارات ہیں جو روزانہ ہمارے اخبارات میں شائع ہوتے ہیں اور جن میں ضروری شرائط درج ہوتی ہیں اس کے علاوہ ان بھی باتوں کو ذاتی معاملات کے دوران پرکھ لیا جاتا ہے اور ناقابل قبول لوگوں کو جواب دیدیا جاتا ہے

اس ضمن میں سب سے زیادہ دلچسپ مثال ڈاکٹروں اور انجینئروں کی ہے سرمایہ داری نظام میں یہ ماہرین بظاہر اپنا "پیسہ" خرچ کر کے یہ ہنر حاصل کرتے ہیں۔ لیکن درحقیقت ان میں سے ہر ایک پر قوم کئی ہزار روپیہ خرچ کرتی ہے جب یہ روپیہ خدمت کی صورت میں واپس کرنے کا وقت آتا ہے۔ تو قوم کے یہ قرضدار اپنی ذمہ داریوں کو فراموش کرتے ہوئے بیرونی ممالک میں اپنی جیبیں بھرنے کے لیئے روانہ ہو جاتے ہیں حالانکہ ان کی خدمات پر پوری قوم بالخصوص غریب عوام کا حق ہے کیونکہ یہ جو کچھ بنے ہیں وہ غریب عوام کے پسینے کا مرہون منت ہے اور قوم کو ان کے اپنے خون پسینے کی ہر بوند کا حساب لینے کا پورا حق ہے

اوپر دیئے گئے حقائق سے جو بات کھل کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں ملک چھوڑ کر جانے کی بجائے کوشش کرنی چاہیئے کہ ہم اپنے ملک میں ظلم و استحصال کے خلاف جدوجہد میں سرگرم حصہ لیں۔

سپرنٹنڈنٹ سنٹرل جیل ملتان کے نام محمود نواز بابر کی درخواست

مجھے پاگل قیدیوں کے ساتھ رکھا گیا ہے

قتل کا صحت مند ملزم ہسپتال میں اور سیاسی ملزم "چکی" میں

بخدمت جناب سپرنٹنڈنٹ صاحب سنٹرل جیل ملتان

نہایت ادب سے استدعا ہے کہ مجھے مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۷۸ء کو صبح تقریباً ساڑھے دس بجے یہاں لایا گیا اور اس وقت سے اب تک باوجود تمام متعلقہ افسران سے کہنے کے میری مندرجہ ذیل شکایات کا کوئی ازالہ نہ کیا گیا ہے جس وجہ سے میں آپ سے مخاطب ہوں۔

۱۔ یہ کہ مجھے جس بیرک میں رکھا گیا ہے اس میں میرے علاوہ دو سزائے موت کے قیدی ہیں اور بقایا تقریباً ۱۲ بھارتی نظر بند یا قیدی ہیں جن میں سے تقریباً ۲ و ۵ بدقسمت ہیں جو کہ شاید دوران تفتیش اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے ہیں۔ یہ بدقسمت فاطر العقل سارا دن ہر طرف گھومتے اور تنگ کرتے ہیں اور رات کو شور و غل کر کے سونا دشوار کر دیتے ہیں۔ اس بیرک سے باہر جانے کی بھی کوئی اجازت نہیں ہے اور یہ جیل کے اندر ایک مزید اذیت ناک جیل ہے جس وجہ سے دن رات میں انتہائی اذیت میں مبتلا ہوں۔

۲۔ یہ کہ بیرک ہذا میں جو کمرہ نما جگہ جسے جیل کی زبان میں "چکی" کہا جاتا ہے مجھے دی گئی ہے وہی سونے کی جگہ ہے وہی کھانے کی وہی لیٹرین اور وہی غسل خانہ بھی ہے کیونکہ بیرک ہذا میں علیحدہ نہ تو کوئی غسل خانہ ہے نہ لیٹرین۔ شاید اس کو ناکافی سمجھتے ہوئے صفائی کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں کیا گیا ہے۔ اور موجودہ انتظام نہ ہونے کے برابر ہے جس سے دن رات کمرے میں انتہائی بدبو رہتی ہے۔

۳۔ یہ کہ مجھے صرف ایک چارپائی دی گئی ہے اور اس کی بھی کل لمبائی ساڑھے پانچ فٹ ہے جبکہ میرا قد چھ فٹ پونے دو انچ ہے۔ مزید کوئی میز یا تپائی وغیرہ نہیں دی گئی ہے۔ اور کل جب میں نے ذرا اصرار کیا تو مجھے کہا گیا کہ ایک دیگر قیدی میاں بابر پرویز کے پاس میز کرسیاں اور چارپائی وغیرہ ہیں اور اس کی ضمانت کل ہو جائے گی تو مجھے مل جائے گی۔ ہیڈ وارڈ مذکور سے پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ سٹور سے یہ ہدایات ملی ہیں۔ مزید معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ شخص مذکور بدنام زمانہ امیر بخش کھوکھر قتل کیس کا ملزم ہے اور نامعلوم وجوہات کی بنا پر دیگر سہولتوں کے علاوہ اسے "سی" کلاس کا حوالاتی اور تندرست صحت مند ہوتے ہوئے ہسپتال میں علیحدہ کمرہ اور سہولیات مندرجہ بالا ملی ہوئی ہیں۔ اس کی وجوہات کا شاید آپ کو بہتر علم ہوگا۔

۴۔ یہ کہ جو راشن مجھے دیا جا رہا ہے وہ انتہائی ناقص مضر صحت اور قانون کے مطابق مقدار سے بہت کم ہے جس سے میرا نظام انہضام مسلسل خراب ہو رہا ہے اور میرا کوئی علاج بھی نہیں کیا جا رہا ہے۔

محولا بالا کی روشنی میں گذارش ہے کہ اپنی پہلی فرصت میں میری یہ قانونی شکایات دور کی جائیں اور مجھے اس قسم کی غیر انسانی ذہنی اور جسمانی اذیت دینے کا سلسلہ ختم کیا جائے۔ میں درخواست ہذا کی ایک نقل اپنے بھائی کو بھی دے رہا ہوں اور مزید قانونی چارہ جوئی کا حق بھی محفوظ رکھتا ہوں۔

العارض

محمود نواز خان بابر نظر بند بیرک ۷
سنٹرل جیل ملتان

سوشل سیکیورٹی میں کروڑوں روپے کا غبن

سوشل سیکورٹی میں کروڑوں روپے غبن کرنے والوں کے خلاف تحقیقات جاری ہے تو اس احتسابی دور میں گورننگ باڈی کے تمام ممبران کی بھی تحقیقات ہونی چاہیئے۔ کیونکہ گورننگ باڈی میں نمائندگی کرنے والے اس میں برابر کے شریک ہیں۔ ان میں سے بعض سوشل سیکورٹی میں مختلف کمیٹیوں کے بھی سربراہ ہیں۔ اور اس لوٹ کھسوٹ میں برابر کے شریک ہیں۔ اس امر کا ثبوت یہ ہے کہ کراچی میں ایسی کئی ایک فیکٹریاں اور ادارے ہیں جن میں ہزاروں مزدور کام کرتے ہیں لیکن آج تک ان اداروں میں سوشل سیکورٹی اسکیم محض اس وجہ سے نافذ نہیں کی گئی کہ سرسے کمیٹی کے سربراہ نے ان اداروں کے لیے منظوری نہیں دی۔ اس ضمن میں صنعتی اداروں کے علاوہ ٹرانسپورٹ سے متعلق بہت سے ادارے موجود ہیں جو اس اسکیم سے مستثنیٰ محض منظوری کی وجہ سے ہیں۔ جبکہ قانون میں گھر کے ملازم کو بھی تحفظ دیا گیا ہے۔ اس طرح اس اسکیم کو چند اداروں میں نافذ نہ کر کے ان اداروں سے بھتے وصول کیے جاتے ہیں۔

اس طرح فیکٹری مالکان نہ صرف سوشل سیکورٹی کنٹری بیوشن (constribution) سے بچ جاتے ہیں بلکہ مزدوروں کو سوشل سیکورٹی کا کارڈ نہ ملنے سے یہ بات بھی ثابت نہیں ہو سکتی کہ یہ مزدور اس فیکٹری کے ملازم ہیں کیونکہ ایسی کئی ایک فیکٹریاں موجود ہیں جہاں مزدوروں کے پاس ملازمت کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہوتا۔ اور مزدوروں کو ماہانہ اجرت کی ادائیگی کے دن ایک لفافہ میں مقررہ رقم دے دی جاتی ہے۔ اس طرح اگر کسی ملازم کو سوشل سیکورٹی کا کارڈ مل جاتا ہے تو اس کارڈ سے مزدور کی ملازمت ثابت ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے مالکان فیکٹری کو مجبوراً وہ تمام حقوق و مراعات دینے پڑتے ہیں جو مزدور قوانین میں دیئے گئے ہیں۔

۱۔ جن افسران کے خلاف تحقیقات ہو رہی ہے ان کو فی الفور سیٹوں سے ہٹایا جائے۔ کیونکہ تحقیقاتی افسران کو مواد مہیا کرنے والے سوشل سیکورٹی افسران کے خلاف انتقامی کارروائی شروع ہو چکی ہے تاکہ مزید پول نہ کھل سکے۔

۲۔ گورننگ باڈی کے تمام ممبران کے معاملات کی بھی تحقیق کرائی جائے۔

۳۔ سوشل سیکورٹی میں ٹھیکیداری نظام ختم کر کے اپنے ہسپتال کھولے جائیں۔

۴۔ موجودہ گورننگ باڈی اپنے فرائض ایمانداری سے انجام دینے میں ناکام ہو چکی ہے۔ اس لیے اس کو توڑ کر نئے ممبران مقرر کیے جائیں۔

۵۔ سوشل سیکورٹی قانون مجریہ ۱۹۶۵ء میں ایسی ترمیم کی جائے جس سے تحفظ شدہ ملازم کو رقم کے ناجائز استعمال ہونے پر پوچھ گچھ کر سکے۔

۶۔ گزشتہ کئی سالوں سے سوشل سیکورٹی فنڈ کی سالانہ رپورٹ نہیں بنی اور سوشل سیکورٹی قانون مجریہ ۱۹۶۵ء کی شق نمبر ۳۳ کے مطابق نہ تو سالانہ رپورٹ چھاپی گئی ہے اور نہ ہی بکنے کے لیے کسی بک اسٹال پر درکار ہے لہٰذا دفعہ ۳۳ کے مطابق عملدرآمد کرایا جائے۔

زندگی اے زندگی

کریم ڈنو وسان

یہ ڈاکو لٹیرے قاتل

ماضی سے زیادہ حال نے کمال ہوس کا مظاہرہ کیا

شاید روزِ اول سے ہی انسان اور ظلم کا ساتھ چلا آ رہا ہے اور طاقتوروں نے کمزوروں کے حقوق غصب کرنے کا فریضہ سنبھال رکھا ہے۔ کچھ انسان ظلم کے آگے سر جھکا دیتے ہیں یا پھر قاتل ڈاکو یا لٹیرے بن کر دوسروں سے انتقام لینے اور اپنی دانست میں ظلم کے خاتمے کے لیے سعی کرتے ہیں جو لاحاصل ہوتی ہے۔ مظلوموں کی اکثریت اس امید اور سہارے پر زندگی گذار دیتی ہے کہ ظلم کی تاریک شب کی کبھی نہ کبھی روشن سحر ہو گی۔ اور ان کی پرامن کاوشیں کبھی تو رنگ لا کر رہیں گی۔ آس و یاس کے اسی گرداب میں مظلوم ڈوبتا اور ابھرتا آیا ہے۔

میری کہانی بھی امید و بیم کے ان مسافروں سے مختلف نہیں۔ صرف اتنی بات ہے کہ نہ تو میں نے ظالموں کے سامنے سر جھکایا نہ ہی قاتل لیٹرا یا ڈاکو بن کر ایسی کہانیاں جنم دے سکا ہوں جو معاشرے کے خود ساختہ اصولوں کو توڑتی ہوں۔ میں تو بس امید و بیم کے سہارے ان افراد کے منصفانہ احساسات کو آواز دینا چاہتا ہوں جن کے اونچے اور شاندار ایوانوں تک ہم غریب اور مظلوم لوگوں کی رسائی نہیں ہو سکتی۔

میں ایک پرائمری استاد ہوں جس کی معاشی و معاشرتی حیثیت اور پستی پر ہر راہنما آنسو بہا کر خود کو انصاف پسند اور حقیقت پسند ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر جس کی حالت کی طرف سے غفلت اور بے پرواہی برتنا ہر اہلِ اقتدار کا شیوہ رہا ہے۔ مجھ سے علم کا نور حاصل کر کے بڑی بڑی کرسیاں اور حیثیتیں حاصل کرتے ہیں اور ہمیں اپنے حال پہ چھوڑ دیتے ہیں تاکہ ہم اپنی اولاد کو جاہل اور نادار چھوڑ کر خود تپ دق یا کسی اور موذی مرض کا شکار ہو کر موت کی آغوش میں چلے جائیں۔

ایک اعتبار سے میں مجرم ہوں اور میرا جرم بڑا سنگین ہے۔ میں نے رسم و روایات کی زنجیروں کو توڑنے کی گستاخانہ جرأت کی ہے۔ میں اپنی اولاد کو جاہل دیکھنا نہیں چاہتا تھا میں انہیں ایک کارآمد شہری اور اچھا انسان بنانا چاہتا تھا۔ اس لیے اپنی ضروریات کا گلا گھونٹ کر انہیں تعلیم دلوانی شروع کی میری ان کوششوں کی زبردست مخالفت کی گئی کیونکہ میں ایک معمولی استاد ہونے کے ساتھ ساتھ مرید بھی ہوں۔ میں اس جرم کی سزا مسلسل بھگت رہا ہوں اور دور کوئی بھی رہا ہو حکومت کسی کی بھی رہی ہو۔ وڈیرہ وڈیرہ تھا اور وڈیرہ ہے دیہاتوں میں قانون انصاف سب کچھ اسی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

اپنے زخمی احساسات بیان کرنے سے بہتر ہے کہ سیدھے
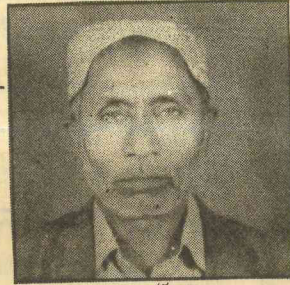
کریم ڈنو وسان

سادے طریقے سے ان حالات کو بیان کروں اور قانون کے محافظوں کے ردعمل کا انتظار کروں۔

۱۔ میرے گاؤں کے نزدیک محکمہ اِنہار کی تقریباً سات ایکڑ زرعی زمین ایک اثر و رسوخ رکھنے والی ہستی نے دس سالہ مقاطعے پر حاصل کی تھی جو انہوں نے مجھ سے چودہ ہزار روپے لے کر مجھے منتقل کر دی۔ زمین اچھی تھی لیکن کافی عرصے سے غیر آباد ہونے کی وجہ سے بڑے بڑے کھڈ پڑ گئے تھے اور جنگل اگ آیا تھا۔ اسے دوبارہ قابل کاشت بنانے پر مجھے تقریباً بیس ہزار روپے خرچ کرنے پڑے اور پہلی فصل میں دو سو من پھٹی (کپاس) حاصل ہوئی۔ پھلتی پھولتی سڑک کے کنارے واقع زمین دیکھ کر "بڑوں" کا جی للچایا اور سابق عوامی حکومت کے ایک صوبائی وزیر کے تعاون سے ایک وڈیرے نے میری بوئی ہوئی فصل کاٹ لی اور زمین پر قبضہ کر لیا۔ اور میرے لیے مسئلے یہ پیدا ہو گئے کہ میں نے زندگی بھر کی پونجی اور دوستوں سے قرض لے کر زمین پر صرف کیا تھا۔ اب وہ قرض کہاں سے ادا کروں اور میڈیکل کالج میں پڑھنے والے دو بچوں اور سیکنڈری اور پرائمری میں پڑھنے والے بچوں کا خرچ کہاں سے پورا کروں۔ اپنے حق میں تمام دستاویزات رکھنے کے باوجود قانون سے کوئی مدد حاصل نہ کر سکا۔

"عوامی دورِ حکومت" ختم ہوا۔ تو مارشل لا کا دور آیا اور نظام مصطفےٰ کے قیام کا مژدہ بھی سنایا جانے لگا۔ مجھے نئے دور میں یہ انصاف حاصل ہوا کہ نظام مصطفےٰ کے قیام کے دعویدار دو رہنماؤں نے میری اس ڈیڑھ ایکڑ (ڈیڑھ لاکھ نہیں، ڈیڑھ ہزار نہیں، ڈیڑھ سو نہیں صرف اور صرف ڈیڑھ ایکڑ) زمین جو میں نے خریدی تھی اور جس کا اندراج میرے نام تھا۔ اس پر حملہ کر کے چالیس من پھٹی لوٹ لی۔ قانون نافذ کرنے والوں نے مجھے اور مجھ سے متعلق افراد کو جرم کم طاقتی میں جیل میں بند کر دیا میرے گھر کی خواتین کو اغوا کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان بیچاریوں نے مٹی کی بنی ہوئی گندیوں (جو گندم رکھنے کے کام آتی ہیں) میں چھپ کر اپنی جان اور آبرو بچائی۔ میرا بیٹا اللہ جڑیو جو ایم بی بی ایس کا

محمود احمد

قادر بخش اور اللہ بخش

طالب علم ہے رپورٹ لکھوانے جب تھانے گیا تو اسے زدوکوب کیا گیا۔ ضمانت پر رہائی کے بعد میں نے سپرنٹنڈنٹ پولیس، ڈپٹی کمشنر اور اس کے بعد فوجی حکام کو تمام واقعات سے مطلع کیا اور بار بار یاد دہانی کرائی مگر ابھی تک انصاف کا انتظار کر رہا ہوں۔

اس واقعے سے پیشتر ۱۹ اور ۲۰ راگست ۱۹۷۶ء کی درمیانی رات کو میرے تین عدد بیل چرا لیے گئے۔ میں رپورٹ درج کروانے سانگھڑ تھانے گیا تو ہماری مدد کو اپنا فرض جتانے والوں نے رپورٹ درج کرنے سے انکار کر دیا۔ میں پولیس اور دوسرے حکام کے در پر دہائی دیتا رہا جس کے نتیجے میں کچھ عرصہ قبل وقوعے کے ڈیڑھ سال بعد نئے ایس پی نے حکم دیا تو رپورٹ درج ہوئی۔ اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ ۔ کون جانے۔

مورخہ ۱۱ر دسمبر ۱۹۷۶ء کو شہر سانگھڑ کے ایک اہم چوک پر پولیس کی موجودگی میں مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے میں جان بچا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے حملہ آور کو پہچان لیا تھا۔ جب میں نے تھانے میں رپورٹ درج کرانی چاہی تو حملہ آور کا نام سن کر پولیس والوں نے مجھے بے عزت کیا اور وڈیروں کے خلاف بولنے کے جرم میں سلاخوں کے پیچھے دھکیل دیا۔ جہاں سے بعد میں ضمانت پر رہائی ہوئی۔

۱۵ر اکتوبر ۷۷ء کو میرے بچے محمود احمد کو جو گورنمنٹ ہائی اسکول سانگھڑ میں نویں جماعت کا طالب علم ہے راہ چلتے ہوئے زدوکوب کیا گیا۔ اس کی سائیکل کے ٹائر کاٹ دیے گئے اور اس سے پانچ روپے اور گھڑی چھین لی۔ حسب سابق پولیس والوں نے رپورٹ درج کرنے کی بجائے مجھے لعنت ملامت کر کے تھانے سے نکال دیا۔

میں نے اور بہت سی باتوں کو بیان نہیں کیا اس لیے کہ میں ان کا ذکر کرنے سے معذور ہوں۔ میری فصل لٹ گئی۔ میری زمین چھن گئی۔ دو بیٹے میڈیکل کے طالب علم ایک بیٹا اور ایک بیٹی سیکنڈری اسکول میں پڑھتے ہیں اور دو بیٹے پرائمری کے طالبعلم ہیں۔ سرکاری ملازمت سے اتنی تنخواہ بھی نہیں ملتی کہ صرف تعلیم کے اخراجات ہی پورے کر سکوں۔ تجربہ یہ بتاتا ہے کہ قانون بڑے لوگوں کے سامنے بے بس ہے۔ ہم کس کو اپنی مظلومیت کی داستان سنائیں؟ کس کو مدد کے لیے پکاریں؟ روشن مستقبل کی آس لگانے والی معصوم آنکھوں کو پلکیں جھپکتے مایوسی سے دیکھتے رہنے دیں یا پھر ان کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے بے نور کر دیں!

پندرہ ہزار کی آبادی کے لیے گرلز ہائی اسکول تک نہیں

یہاں علم حاصل کرنا منع ہے

تعلیمی ادارے ہر ملک کی قومی ضرورت ہوتے ہیں تعلیمی ادارے ملک کی بقا اور سلامتی کے لیے اہم ترین کردار انجام دیتے ہیں۔ علم کے بغیر ترقی اور خوشحالی کا تصور بھی ناممکن ہے۔ علم کے بغیر کوئی قوم نہ تو ترقی کر سکتی ہے اور نہ ہی اپنی سلامتی کی ضمانت دے سکتی ہے اگر یہ کہا جائے کہ کوئی قوم علم کے بغیر اپنا قومی تشخص تک برقرار نہیں رکھ سکتی تو یہ غلط نہ ہوگا۔ علم وقت کی اہم ترین ضرورت ہے اور علم حاصل کرنے کے لئے درسگاہوں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اور ترقی کی خواہشمند قومیں اپنے تعلیمی اداروں پر خصوصی توجہ صرف کرتی ہیں کیونکہ ان اداروں سے فارغ التحصیل ہونے والے ہی ملک کو ترقی کی جانب لیجا سکتے ہیں۔

لیکن اس دور میں بھی وطن عزیز کا ایک شہر ایسا بھی ہے جہاں ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے کہ شہر کے تعلیمی اداروں کو آثار قدیمہ میں شامل کر لیا جائے جہاں تعلیم حاصل کرنے کے لائق تحسین جذبے کو کچلا جا رہا ہے جہاں مستقبل کے معماروں کو مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ علم کی نعمت سے محروم رہیں۔ جہاں تعلیم حاصل کرنے والوں کو طرح طرح کی پریشانیوں میں مبتلا کیا جا رہا ہے یہ شہر کنری ہے کیونکہ ملک کی سب سے بڑی مرچ منڈی اسی شہر میں واقع ہے۔ یہاں کی مرچ نہ صرف اندرون ملک استعمال ہوتی ہے بلکہ برآمد کی جاتی ہے۔ لیکن "نام بڑے درشن چھوٹے" کے مصداق یہ شہر جس قدر مشہور ہے اسی قدر پسماندہ ہے اور تو اور شہر بھر کی مشترکہ ضرورت "اسکول" بھی اپنی بے چارگی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ سب سے زیادہ قابل رحم حالت کنری کے "مین گرلز پرائمری اسکول" کی ہے جہاں ننھی ننھی معصوم بچیاں سخت سردیوں میں کھلے آسمان تلے بیٹھ کر علم حاصل کرتی ہیں۔ یہ پھول سے شگفتہ شگفتہ چہرے چلچلاتی دھوپ میں بھی کھلے آسمان تلے بیٹھ کر علم کی شمع روشن رکھتے ہیں۔ آفرین ہے ان ننھی منی کلیوں پر جو علم حاصل کرنے کے لئے ٹھٹھرتی سردی اور چلچلاتی دھوپ کا مسلسل مقابلہ کر رہی ہیں۔ یہ بچیاں قابل تقلید ہیں ان کے لئے جو وقتی مصائب سے گھبرا کر مقصد حیات سے ہٹ جاتے ہیں۔ یہ بچیاں تین سال سے انہی حالات کا مقابلہ کر رہی ہیں۔ اور نہ جانے کب تک کرتی رہیں کیونکہ ان کی تکلیف کا احساس کرنے والا کوئی نہیں۔ کوئی نہیں جو ان بچیوں کی تکلیف پر تڑپ اٹھے وہ اس لیے کہ یہ بچیاں ہر وہ دروازہ کھٹکھٹا چکی ہیں جہاں سے انہیں ہمدردی کی معمولی سی بھی توقع تھی۔

محکمہ تعلیم سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان ہے ضلعی انتظامیہ بھی صورتحال سے واقف تو ہے مگر "مجبور" ہے شہری انتظامیہ بے چاری کو تو جنرل ہیڈ سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ پھر وہ شہر کے دیگر معاملات کی طرف کیا خاک توجہ دے۔ رہ گئے شہر کے لیڈران کرام۔ معززہ اور مخیر حضرات تو جناب ان حضرات کا کام صرف یہ ہے کہ اخبارات میں خبریں اور فوٹو چھپوا لیے۔ اور کسی ضلعی یا ڈویژنل افسر کی آمد پر ان سے "ہاتھ ملانے" چلے گئے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

اب آپ ہی کہیئے کہ یہ حالات کب ختم ہوں گے کیا یہ صورتحال ان بچیوں کو مجبور نہیں کر دے گی۔ کہ وہ تعلیم کو خیرباد کہہ دیں۔

یہ تو تھی پرائمری اسکول کی بچیوں کی حالتِ زار۔
اب ذرا ملاحظہ فرمایئے غزالی گرلز مڈل اسکول کی طالبات کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی ایک جھلک۔ یہ اسکول صرف مڈل تک ہے جبکہ ۱۵۰۰۰ کی آبادی کے شہر کنری کے لیے کالج نہیں تو کم از کم ہائی اسکول تو ضروری ہے اس صورتحال میں وہ طالبات جو سائنس پڑھنا چاہتی ہیں آٹھویں درجے کے بعد دوسرے شہروں میں جانے پر مجبور ہو جاتی ہیں جبکہ آرٹس کی طالبات مڈل کے بعد لڑکوں کے واحد ہائی اسکول کی پرائیویٹ طالبات کی حیثیت سے میٹرک کرتی ہیں اس طرح وہ لڑکیاں جو سائنس پڑھنے کی خواہشمند تو ہیں مگر دوسرے شہروں میں رہائش کا مناسب انتظام نہ ہونے کی وجہ سے مجبوراً آرٹس پڑھتی ہیں یا پھر تعلیم ختم کر دیتی ہیں۔ یہ صورتحال محکمہ تعلیم کے اعلیٰ حکام کے بارہا گوش گزار کی گئی مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات"

محکمہ تعلیم کی کارکردگی کا اندازہ آپ ایک چھوٹے سے واقعے سے لگا لیجیے کہ گزشتہ سال اسی غزالی مڈل اسکول کی ایک دیوار برسات کے سبب گر گئی تھی۔ ۱۲۰ فٹ لمبی دیوار کا یہ ٹکڑا ایک عرصے سے منتظر رہا۔ محکمہ تعلیم اور شہر کے معززین کی نظرِ التفات کا۔ شہر بھر کی لڑکیاں اس اسکول میں زیرِ تعلیم ہیں جن کی بے پردگی کا نہ تو محکمہ تعلیم کے کسی افسر کو احساس ہوا اور نہ ہی شہر کے نام نہاد لیڈروں کو۔ اس نیک کام میں اگر کسی نے پہل کی تو وہ اس اسکول کی طالبات کے بزرگ نہیں تھے بلکہ ان کے طالبِ علم بھائی تھے۔ جن سے اپنی طالبات بہنوں کی یہ بے چارگی نہ دیکھی گئی۔

" سلیم مغل " شہر کنری کا ہونہار فرزند نوجوان جذبوں کا آئینہ دار۔ یہ نوجوان ہی ہے جو ان طالبات کی مدد کے لیے پیش پیش رہا۔ ان کی سربراہی میں کنری اسٹوڈنٹس کونسل نے مختلف ذرائع سے رقم اکٹھی کی۔ اور ۱۲۰ فٹ لمبی اور ۱۰ فٹ اونچی دیوار تعمیر کروائی۔ اس دیوار کی تعمیر کے وقت ان طلبہ نے خود تگاریاں اٹھائیں اپنے ہاتھوں سے اینٹیں اٹھائیں جس کے صلے میں شہر کے خود ساختہ ٹھیکیداروں نے ان طلبہ پر مختلف الزامات کی بھرمار کر دی۔ وہ زبانیں جو ان طلبہ کی حمایت کے وقت گنگ ہو گئی تھیں ان کی مخالفت میں اسقدر رواں ہوئیں کہ عورتوں کے زیادہ بولنے کے ریکارڈ بھی توڑ دیئے۔ لیکن آفرین ہے ان طلبہ پر کہ انہوں نے ان الزامات کے جواب میں نہایت ہی صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا اور بجائے جوابی الزام تراشی کے خود کو محاسبے کے لیے پیش کر دیا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی طالبات بہنوں کی مدد بھی کرتے رہے جس کی تازہ ترین مثال مین گرلز پرائمری اسکول کی بچیوں کے لیے پانی کی ٹینکی کی تعمیر ہے یہ ٹینکی کس طرح تعمیر ہوئی۔ اور اسکول کے لیے واٹر کنکشن کس طرح لیا گیا۔ یہ ایک الگ داستان ہے۔

تو جناب یہ ہے کنری کے صرف دو اسکولوں کی حالت لقبیہ اسکولوں کا حال بھی ان سے کچھ مختلف نہیں۔ کہیں اساتذہ کی کمی ہے تو کہیں فرنیچر نہیں۔ کہیں کمرے نہیں تو کہیں طلبہ کے لیے تجربات کا سامان نہیں۔ کیا ہم توقع رکھیں کہ وہ حضرات ان مسائل کو حل کرنے کے لیے اپنے اپنے ڈرائنگ روم سے باہر تشریف لائیں گے۔ جو دورانِ الیکشن آسمان سے تارے توڑ لانے کے دعویدار تھے؟ کیا وہ والدین ان مسائل کے حل کے لیے قدم اٹھائیں گے جن کی بچیاں ان اسکولوں میں زیرِ تعلیم ہیں۔؟ ■

میرپور ماتھیلو

پاک سعودی کھاد فیکٹری میں بدعنوانیاں

اللہ بچایو

پاک سعودی فرٹیلائزر فیکٹری میرپور ماتھیلو کے مزدور انتظامیہ کی بدعنوانیوں اور دھاندلیوں سے سخت پریشان ہیں۔ انتظامیہ ایک طرف تو اپنی لوٹ کھسوٹ سے فیکٹری کو نقصان پہنچا رہی ہے تو دوسری طرف مزدوروں کے ساتھ ناانصافیاں کر کے ان کے استحصال کو شدید کر رہی ہے۔ پاک سعودی فرٹیلائزر فیکٹری میرپور ماتھیلو میں ہونے والی سنگین لوٹ کھسوٹ اور دھاندلیوں کا اندازہ مندرجہ ذیل حقائق سے کیا جا سکتا ہے۔

فیکٹری کے افسران لیبر سپلائر سے گٹھ جوڑ کر کے ایک سو پچاس مزدوروں کو کام پر لگانے کے احکامات جاری کرتے ہیں۔ اور اندراج بھی ایک سو پچاس ہی کا کیا جاتا ہے لیکن کام پر کل سو مزدور لگائے جاتے ہیں۔ اس طرح انتظامیہ کے متعلقہ افسران اور سپلائر پچاس مزدوروں کی اجرت جو کہ تقریباً پندرہ ہزار روپے ہوتی ہے ہضم کر جاتے ہیں۔

سرکاری سیمنٹ اور دیگر عمارتی سامان زبردست پیمانے پر "خرد برد" کیا جا رہا ہے۔

انتظامیہ اپنے خود ساختہ ٹھیکیداروں کے نام برائے نام رقم پر مختلف کاموں کے ٹھیکے چھوڑ دیتی ہے تاکہ "قانونی انداز" میں فیکٹری کے منافع کو ہضم کر لیا جائے۔

روہڑی سیمنٹ فیکٹری سے سیمنٹ لانے والے ہر ٹرک سے مبینہ طور پر ایک سو پچاس روپے بطور رشوت وصول کرنا انتظامیہ کے فرائض میں شامل ہے۔

افسران فیکٹری کے مختلف اسٹوروں میں "اپنے آدمی" بھرتی کرتے ہیں تاکہ ان کے ذریعہ خرد برد کرنا آسان رہے سپلائر کو بونس اور اوور ٹائم دیا جاتا ہے تاکہ اس طرح اپنی جیبی آمدنی میں اضافہ کیا جائے۔

اس سلسلے میں یہاں یہ مطالبات کیے جاتے رہے ہیں کہ لیبر سپلائی کے تمام ٹھیکے ختم کیے جائیں۔ ٹریننگ حاصل کرنے والے تمام افراد کو کام پر لگایا جائے۔ تمام مزدوروں کو پاک سعودی فرٹیلائزر فیکٹری ہی ملازم رکھے۔ ملازمتوں میں علاقے کے لوگوں کو ترجیح دی جائے اور ادارے کو بدعنوان افسران سے پاک کیا جائے تاکہ یہ پروجیکٹ کامیابی سے ہمکنار ہو سکے۔

ٹکا خاں کا انٹرویو دوبارہ شائع ہوگا

ہم قارئین کرام، ایجنٹ اور ہاکرز حضرات سے دلی معذرت کا اظہار کرتے ہیں کہ ہم مانگ کے مطابق گزشتہ شمارہ مہیا نہیں کر سکے۔ حالات آپ کے سامنے ہیں یہ انٹرویو دوبارہ شائع ہوگا۔ لیکن کب۔ اس کا فیصلہ ہمارے اور آپ کے ہاتھ میں نہیں۔ پابندی ہٹ جائے تو پھر۔ انشاء اللہ۔ "ادارہ"

یہ BBC ہے

یکم مارچ ۱۹۷۸ء

آج پاکستان پیپلز پارٹی کے مرکزی سیکرٹری اطلاعات مولانا کوثر نیازی کو پارٹی سے نکال دیا گیا۔ اس کا اعلان قائم مقام چیئرمین بیگم نصرت بھٹو نے لاہور میں اپنی رہائش گاہ پر کیا۔

۲ مارچ ۱۹۷۸ء

بی بی سی نے آج رات اپنی اردو سروس میں خبر دی ہے کہ سابق وزیر اعظم مسٹر بھٹو کے خلاف قتل کے مقدمہ کی سماعت اب مکمل ہو گئی ہے۔ ایک ماہ کے لئے سیاسی سرگرمیوں پر پابندی کا جو فیصلہ کیا گیا ہے اس کی اصل وجہ بھی یہی تھی مسٹر بھٹو نے شکوہ کیا تھا کہ اس مقدمہ کی سماعت منصفانہ طور پر نہیں ہو رہی ہے اور انہوں نے صفائی پیش کرنے سے انکار کیا تھا۔ یہی مقدمہ پیپلز پارٹی اور فوجی حکومت کے درمیان کشیدگی کی وجہ ہے۔ قانونی اعتبار سے یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں کہ مسٹر بھٹو مجرم ہیں یا بے گناہ مگر سیاسی اعتبار سے کوئی فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ اس لئے کہ نتائج سنگین ہو سکتے ہیں۔ اگر مسٹر بھٹو رہا کر دیئے گئے تو مقدمہ چلانے کی پالیسی احمقانہ معلوم ہوگی۔ بہر حال جو لوگ ان کو ملزم نہیں قبول کرتے ان کا ردّ عمل سخت ہوگا۔ لوگ بدعنوانی اور دھاندلی کے تمام الزامات کو نظر انداز کرتے ہیں۔ اگر مسٹر بھٹو کو سزائے موت دی جاتی ہے تو فوج کی مخالفت بڑھ سکتی ہے۔

بی بی سی نے آج رات یہ بھی بتایا کہ پیپلز پارٹی کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر غلام حسین کا مقدمہ نا اہلی کے ٹریبونل میں پیش کر دیا گیا ہے اس لئے وہ ٹریبونل کا فیصلہ ہونے تک سیاست میں حصہ نہیں لے سکتے۔ اسی بنا پر آج جنرل ٹکا خان کو ایڈیشنل سیکرٹری جنرل بنا دیا گیا ہے۔ وہ فوج کے چیف آف اسٹاف رہ چکے ہیں اور مسٹر بھٹو کے مشیر امور سلامتی بھی تھے۔ پہلے وہ سیاست میں حصہ نہیں لیتے تھے لیکن فوج سے علیحدگی کے بعد پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے

۳ مارچ ۱۹۷۸ء

آج رات بی بی سی نے اپنی اردو نشریات میں بتایا کہ پاکستان میں سیاسی سرگرمیوں پر پابندی کے بعد مختلف علاقوں سے مسٹر بھٹو کے حامیوں کی گرفتاری کی اطلاع ملی ہے۔ بی بی سی کی ایسٹرن سروس کے ڈیوڈ پیج نے اپنے تبصرہ میں کہا ہے کہ جنرل ضیاؔ کی فوجی حکومت کو اب آٹھ ماہ بعد سب سے سنگین چیلنج کا سامنا ہے انہوں نے جولائی میں مسٹر بھٹو کو معزول کر کے اقتدار سنبھالا تھا اس وقت بھٹو حکومت کی شدید مخالفت ہو رہی تھی اور جنرل ضیاؔ کا ایک سب سے زیادہ لبرل فوجی لیڈر کے طور پر خیر مقدم کیا گیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ ان کی حکومت محض ایک نگران حکومت ہوگی اور وہ تین دن کے اندر انتخابات کرا دیں گے لیکن ان کے اقتدار کو ۸ ماہ ہو گئے اس مدت میں ان کی حکومت کے کردار اور مقاصد میں تبدیلی

ہوتی رہی ہے۔ انہوں نے عام انتخابات ملتوی کر دیئے اور مسٹر بھٹو کی کھلی مذمت کی تھی۔ انہوں نے ایک ریفری کا کردار بھی ترک کر دیا اور مصلح کا کردار اختیار کر کے محاسبہ شروع کر دیا لیکن عوام کی نظر میں بھٹو کے خلاف جذبہ عمل تیز نہ ہو سکا۔ مسٹر بھٹو کو اپنے سات سالہ اقتدار میں کسی سنگین چیلنج کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا لیکن اب نا اہلی کے ٹریبونل کو جن سیاست دانوں کے نام بھیجے گئے ہیں ان میں زیادہ تر بھٹو کے ساتھی ہیں۔ بھٹو پر اپنے ایک سیاسی مخالف کے والد کے قتل کا مقدمہ آخری مرحلہ میں ہے لیکن انتخاب میں دھاندلی وغیرہ کے دوسرے الزامات بھی ہیں۔ جنرل ضیاؔ چاہتے ہیں کہ عوام ان الزامات کے پیش نظر مسٹر بھٹو کے اعمال اور بد اعمالیوں کا خود اندازہ لگائیں لیکن لوگوں میں محاسبہ کے عمل سے مسٹر بھٹو کی مقبولیت کم ہونے کی بجائے بڑھ گئی اور فوج کو معلوم ہے کہ وہ نیک نام ہو رہے ہیں۔ گذشتہ سال ان کی پارٹی کی مقبولیت کم ہو گئی تھی مگر اب اس پارٹی نے ان کی بیگم کی شخصیت کے گرد مضبوط حیثیت اختیار کر لی ہے۔ یہ واحد جماعت ہے جو فوجی حکومت کی مخالفت کرتی ہے اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندی کے باوجود عوام کی

نظروں سے نہیں گری ہے۔ جنرل ضیاؔ کی حکومت کے لئے عوام کی حمایت مسلسل کم ہو رہی ہے اور عوام میں بھٹو کی پارٹی کو دوبارہ اعتماد حاصل ہو گیا ہے۔ عوام کو بھٹو کی حکومت میں جن باتوں کی شکایت تھی وہ آج بھی موجود ہیں جنرل ضیاؔ کے لئے ایک مشکل یہ بھی ہے کہ ان کو عوام نے اقتدار نہیں دیا ہے اور ان کو یقین نہیں ہے کہ اگر وہ انتخابات کرا دیں تو بھٹو اور ان کی جماعت کو کامیابی نہیں ہوگی مسٹر بھٹو پر جو مقدمہ آخری مرحلہ میں ہے اس کے فیصلے کے بعد محاذ آرائی نازک صورت اختیار کر سکتی ہے۔ سیاسی سرگرمیوں پر پابندی سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت اس معاملہ میں پریشان ہے۔ بہر حال مسٹر بھٹو کے مقدمہ کا جو بھی فیصلہ ہو، پیپلز پارٹی اور حکومت کے درمیان محاذ آرائی کم ہونے کے بجائے

زیادہ شدت اختیار کرے گی ۔

۴ مارچ ۱۹۷۸ء

بی بی سی نے آج رات اپنی اردو نشریات میں بتایا کہ جنرل ضیا نے سیاسی صورت حال پر بات چیت کے لئے سیاستدانوں کی تجویز قبول کر لی ہے اور وہ آج رات سیاستدانوں سے اسی بارے میں باتیں کریں گے۔ آج جو سیاسی کانفرنس ہوئی اس میں پیپلز پارٹی اور تحریک استقلال کا کوئی نمائندہ شریک نہیں ہوا۔ آج کی بات چیت ساڑھے چار گھنٹے تک جاری رہی۔ بی بی سی نے کہا کہ اخبارات نے ایسی کوئی بات شائع نہیں کی جس سے سیاسی کانفرنس میں ہونے والی بات چیت کے متعلق پہلے سے کچھ معلوم ہو جاتا پیپلز پارٹی کی طرف سے بائیکاٹ تعجب خیز نہیں ہے سرکاری موقف یہ رہا ہے کہ جب تک بھٹو صاحب قید ہیں وہ فوج سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتی۔ تحریک استقلال نے بھی آج کی سیاسی کانفرنس میں حصہ نہیں لیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فوج سے اس کے اختلافات پیدا ہو گئے ہیں مولانا نورانی بھی شریک نہ تھے جو قومی اتحاد میں تو شامل ہے مگر اختلافات رکھتی ہے ۔

۵ مارچ ۱۹۷۸ء

بی بی سی نے آج رات اپنی اردو نشریات میں بتایا کہ کل رات جنرل ضیاء الحق سے قومی اتحاد کے سیاست دانوں نے سیاسی صورت حال پر تین گھنٹے تک تبادلہ خیال کیا۔ قومی اتحاد نے بھی طور پر سیاسی سرگرمیوں کی ممانعت کے سلسلے میں تشویش کا اظہار کیا تھا۔ اب قومی اتحاد کے نائب صدر جناب نصراللہ خاں نے یہ تاثر دیا ہے کہ وہ جنرل ضیاء الحق کی وضاحت سے جزوی طور مطمئن ہو گئے ہیں بی بی سی نے مزید بتایا کہ جنرل ضیا سے سیاسی صورت حال پر سیاست دانوں کی بات چیت رات گیارہ بجے شروع ہوئی اور صبح دو بجے تک جاری رہی سیاسی صورت حال کے تمام پہلوؤں پر غور کیا گیا۔ جناب نصراللہ خان کا کہنا ہے کہ قومی اتحاد کی آٹھوں جماعتوں کے سربراہ مذاکرات میں شریک تھے اور وہ جنرل ضیا کی وضاحتوں سے جزوی طور پر مطمئن ہیں۔ بہر نوع سیاسی سرگرمیوں پر پابندی کو پیپلز پارٹی کے خلاف سمجھا جا رہا ہے جب کہ حکومت یہ کہہ رہی ہے کہ اس پابندی کا مقصد لوگوں کے مزاج کو ٹھنڈا کرنا ہے۔ قومی اتحاد کو اس بات پر تشویش ہے کہ پیپلز پارٹی کے محاسبہ کی رفتار سست ہے اور انتخابات کے لئے وقت کا تعین مبہم ہوتا جا رہا ہے قومی اتحاد والوں کو فیصل آباد وغیرہ میں اپنے کچھ کارکنوں کی گرفتاری پر تشویش ہے ۔

غیبوں کی ڈائری

بی بی سی
سننے پر بھی پابندی لگائی جائے
اصغر خان ورزش کر رہے ہیں

جتوئی اور نیازی ہانڈی پکا رہے ہیں

جمعیت العلمائے پاکستان کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی بڑے شاطر نکلے۔ ملک میں سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگنے سے پہلے ہی ملک سے باہر چلے گئے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مولانا کو قبل از وقت ہی اس بات کی سن گن لگ گئی تھی یہی وجہ ہے کہ وہ افریقی ملکوں کے تفریحی دورے کا بہانہ بنا کر ملک سے باہر چلے گئے یکم مارچ سے ملک میں جوں ہی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگی توں ہی سیاسی سرگرمیوں کی جگہ سیاسی چہ میگوئیوں نے لے لی۔ افواہوں کی ایسی ایسی پھلجڑیاں چھوٹ رہی ہیں کہ رہے نام سائیں کا۔ افواہوں کا رس کانوں میں گھولنے والوں کو اس کی خبر بھی نہیں کہ سننے والوں کے کان پکنے لگے ہیں.

آج کل جن سیاسی چہ میگوئیوں کی ریل پیل ہے وہ یہ ہیں. ۱- سیاسی سرگرمیوں پر پابندیاں جو فی الحال ایک ماہ کے لیے ہیں ان کی مدت کم از کم تین ماہ ہو جائے گی ۔(۲) حکومت بہت جلد انتخابات کرانا چاہتی ہے کہا جا رہا ہے کہ نواب محمد احمد کے مقدمہ کے فیصلے کے بعد اسی ماہ عام انتخابات کی تاریخ کا اعلان کر دیا جائے گا۔ رائے فارمولے پر عمل کیا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔

سیاسی سرگرمیوں پر پابندی کے بعد پی این اے کے رہنما کسی نہ کسی دھندے سے لگ گئے ہیں انہوں نے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی طرف سے تیل گیس کے معاملات پر بریفنگ کے لئے بلوائی گئی کانفرنس میں شرکت کی اور ایک عدد ڈنر میں شرکت کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے فوٹو بھی کھنچوائے۔ اس کانفرنس، ڈنر اور تصویر بنوانے کے عمل سے اس بار تحریک استقلال کے رہنما باز رہے۔ حالانکہ پچھلی کانفرنس میں تحریک استقلال کے نٹ کھٹ رہنما مسٹر مشیر احمد پیش امام نے مبصر کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔ سنا ہے کہ تحریک والوں کے تیور بڑے خطرناک موڑ پر آ گئے ہیں۔ یہ خبر بھی آئی ہے کہ سیاسی سرگرمیوں پر پابندی کے بعد سے تحریک کے "مستقل مزاج" رہنما مسٹر اصغر خان صبح شام بلاناغہ ورزش کرتے دیکھے جا رہے ہیں ادھر مسٹر جتوئی اور مولانا کوثر نیازی کے بارے میں یہ خبر اڑتی اڑتی آئی ہے کہ یہ حضرات مشترکہ ہانڈی پکانے کی کوشش کر رہے ہیں کہا جاتا ہے کہ چونکہ مسٹر جتوئی پکائی کرنے میں اناڑی ہیں اس لئے چمچہ چلاتے ہوئے گھبراہٹ کا شکار ہو جاتے ہیں مولانا جیسے استاد کی سرپرستی میں ممکن ہے کہ بہت جلد استاد بن جائیں۔

ہمیں کچھ قارئین کے خطوط آئے ہیں جن میں سے ایک خط میں ایک صاحب نے ہماری وساطت سے حکومت

(باقی صفحہ ۳۸ پر)

ملتان — ناصر زیدی

ملتان میں سات ہزار مزدور بیروزگار کر دیئے گئے

کھاد فیکٹری میں کروڑوں روپے کے غبن کا احتساب کب ہوگا

یوں تو سارے ملک کے مزدوروں میں بے چینی موجود ہے اور اس بے چینی کا اظہار تقریباً تمام اداروں کی نمائندہ مزدور تنظیموں نے کیا ہے اپنی تنظیموں کی مشترکہ تنظیم مرکزی رابطہ کمیٹی کی اپیل پر محنت کشوں نے ملک گیر احتجاج بھی کیا ہے لیکن محنت کشوں کے احتجاج پر حکمرانوں نے توجہ تک دینا گوارہ نہیں کیا ہے بلکہ اس کے برعکس دھمکیوں کا سلسلہ جاری ہے محنت کشوں کے مسائل پر حکومت کی خاموشی سے نجی سرمایہ کاروں کو حوصلہ ملا ہے اور انہوں نے مزدوروں پر رزق کے دروازے بند کرنا شروع کر دیئے ہیں نوکر شاہی سے ملی بھگت کر کے مزدور رہنماؤں پر مقدمات قائم کرائے جا رہے ہیں اور ٹریڈ یونین سرگرمیوں پر بھی پابندیاں عائد کی جا رہی ہیں۔

ملتان میں کم و بیش پچاس صنعتی اداروں میں تقریباً ۸۰ ہزار مزدور کام کرتے ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ان اداروں میں سات سے آٹھ ہزار مزدوروں کو روزگار سے محروم کر دیا گیا ہے بے شمار مزدوروں پر مقدمات بھی درج کیے گئے کالونی ملز میں مزدوروں کے قتل عام کے بعد بھی سرمایہ دار اور نوکر شاہی کے مزدور دشمن اقدامات جاری ہیں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ قتل عام کے حقیقی اسباب کا سدباب کیا جاتا اور جن وجوہات کی بنا پر اتنا بڑا سانحہ وقوع پذیر ہوا تھا ان کی نشاندہی کر کے ان کو دور کیا جاتا لیکن اس کے برعکس مزدوروں کے خلاف اقدامات میں زیادہ تیزی پیدا ہو گئی ہے۔ مزدور قیادت کو مارشل لاء کے تحت گرفتار کر لیا گیا ہے ان گرفتاریوں سے ملز کی صورتحال انتہائی خراب ہوتی جا رہی ہے۔ دوسری طرف مزدوروں کے معاشی مطالبات میں سے کچھ کو تسلیم کرنے کا اعلان کیا گیا تھا مگر ان پر مکمل طور پر عملدرآمد نہیں کیا گیا ہے کالونی ملز تیزی سے دوسرے بحران کی طرف بڑھ رہی ہے اگر محنت کشوں میں موجود بے چینی کو دور نہ کیا گیا تو صورتحال پہلے سے بھی زیادہ خطرناک صورت اختیار کر سکتی ہے جو عظیم سانحہ بھی بن سکتی ہے۔

پاک عرب کھاد فیکٹری میں سات مزدور رہنما پانچ سال سے مسلسل بے روزگاری کا شکار ہیں ان مزدور رہنماؤں کا قصور یہ ہے کہ انہوں نے پاک عرب کھاد فیکٹری کے سفید ہاتھیوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔ کروڑوں روپے کے غبن کے سکینڈل بے نقاب کیے تھے یہ رہنما بھٹو دور میں نوکر شاہی کی سازش کا شکار ہوئے۔ لیکن آج احتساب احتساب کے شور و غوغا کے باوجود کھاد فیکٹری کے معاملات کی تحقیقات نہیں کرائی گئی کھاد فیکٹری کے مزدور رہنما خان محمد نثار اور مقبول انیس ایڈووکیٹ نے ہمیں بتایا کہ انتظامیہ نے اب تک مزدوروں کے خلاف مقدمات میں لاکھوں روپے ضائع کر دیئے ہیں اور اپنی تمام تر توجہ مزدور دشمن اقدامات پر مرکوز کی ہوئی ہے نئی فیکٹری کی تنصیب کا کام ابھی تک مکمل نہیں ہوا جس کی وجہ سے قومی معیشت کو کروڑوں روپے کا نقصان ہو رہا ہے گزشتہ برسوں میں متواتر مزدور کش اقدامات سے مزدوروں میں غم و غصہ کی فضاء کا پیدا ہونا لازمی امر ہے انہوں نے بتایا کہ اگر برطرف مزدوروں کو بحال نہ کیا گیا اور فیکٹری کے معاملات پر فوری توجہ نہ دی گئی تو صنعتی بے چینی خطرناک رخ اختیار کر سکتی ہے ٹیکسٹائل انڈسٹری میں بھی سرمایہ داروں کی لوٹ کھسوٹ اور مزدور دشمن پالیسیوں کے سبب مزدور سخت بے چین ہیں۔ صنعتی مزدوروں کا پچاس فیصد اسی انڈسٹری سے وابستہ ہے۔ مزدوروں کی اجرتیں انتہائی قلیل ہیں اور مزدور قوانین کے تحت دیگر سہولتوں کا بھی فقدان ہے ہر مل میں سرمایہ دار نے اپنی ریاست قائم کی ہوئی ہے ٹریڈ یونین سرگرمیوں کی قطعاً اجازت نہیں ہے اگر کہیں مزدور اپنے اتحاد کا مظاہرہ کرتے بھی ہیں تو سرمایہ دار غنڈوں کی مدد سے مزدور اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور سرمایہ داروں کے غنڈوں کو پولیس کی سرپرستی بھی حاصل ہوتی ہے یونائیٹڈ ٹیکسٹائل ملز اللہ وسایا ٹیکسٹائل ملز خاص طور پہ ماڈرن بیگار کیمپ ہیں۔ جہاں آئے دن مزدوروں کو برطرف کر دیا جاتا ہے اور کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ اب تک اس صنعت سے سینکڑوں مزدوروں کو روزگار سے محروم کر دیا گیا ہے تعمیراتی کمپنیوں کے مزدور بھی باقی مزدوروں کی طرح معاشی قتل عام کی زد میں ہیں ملتان میں بڑی بڑی کمپنیوں میں ایم ایل سی لمیٹڈ اے ای سی، حمید مسعود لمیٹڈ ہیں۔ جہاں تقریباً پانچ ہزار مزدور روزانہ اجرت پر کام کرتے ہیں۔ کئی کمپنیوں کے افسران نے یونین کے تمام عہدیداروں کو ملازمت سے برطرف کر دیا کر دیا ہے ایک اندازہ کے مطابق صرف ایم ایل سی کنفورین اور اے سی سی میں پچھلے آٹھ ماہ کے دوران ہزاروں مزدوروں کو روزگار سے محروم ہونا پڑا ہے ان کمپنیوں کا طریق کار یہ ہے کہ جب مزدور متحد ہو کر یونین تشکیل دیتے ہیں۔ تو فوراً ہی ان کمپنیوں کی انتظامیہ پرانے مزدوروں کو برطرف کر کے نئے مزدور بھرتی کر لیتی ہے مزدور نمائندوں کے مطابق لیبر ڈیپارٹمنٹ بھی مزدوروں کے خلاف انتظامیہ کی کارروائی میں ان کا ساتھ دیتا ہے۔ ملتان میں تین گھی ملیں ہیں جن میں ڈیڑھ ہزار سے زائد مزدور کام کرتے ہیں۔ ان ملوں میں بھی صنعتی بے چینی موجود ہے۔ یہاں بھی چھانٹی کے منصوبے بنائے جا رہے ہیں۔ روز گھی ملز میں سالونٹ پلانٹ کو نجی تحویل میں دینے کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے جس سے مزدوروں میں بے چینی پیدا ہو رہی ہے اسی طرح احمد کنکریٹ، سوئی گیس واپڈا، مسیکو، سٹیل پیکیجز، میونسپل کارپوریشن، کنٹونمنٹ بورڈ، پیرا میڈیکل اسٹاف، روٹی پلانٹ، کاٹن ٹریڈنگ کارپوریشن کے محنت کشوں میں بھی بے چینی موجود ہے روز افزوں مہنگائی اور افراط زر نے مزدوروں کی قوت خرید کو کم کر دیا ہے اس لیئے تمام اداروں کے مزدور اجرتوں میں اضافہ کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہیں ان حقیقی مسائل پر خصوصی توجہ نہ دی گئی تو صنعتی امن کسی بھی لمحہ خراب ہو سکتا ہے بینکوں کے کارکنوں نے بھی اپنے مطالبات کے سلسلے میں ہفتہ احتجاج شروع کیا ہوا ہے۔ کارکنوں کا مطالبہ ہے کہ ویج بورڈ ایوارڈ کمیشن کی رپورٹ پر فوری عملدرآمد کیا جائے اور برطرف کارکنوں کو بحال کیا جائے۔ یونائیٹڈ بینک کی تمام برانچوں میں بینرز اور پوسٹر لگے ہوئے ہیں بینک کی یونین کے اجلاس میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ تمام برطرف کارکنوں کو فوراً بحال کیا جائے۔ اور دیگر مطالبات بھی تسلیم کیے جائیں۔ بصورت دیگر کارکن انتہائی اقدام اٹھانے سے دریغ نہیں کریں گے۔

انڈونیشی جنرل نے بچوں کی سالگرہ پر فلپائن سے آئس کریم منگوائی

زبانی فرمائش کی تکمیل رشوت میں شامل نہیں ہوتی

انڈونیشیا کا ایک جنرل اپنے بچوں کی سالگرہ کے موقع پر منیلا سے آئس کریم منگواتا ہے۔ ایک دوسرا گولف کورس کی پرائیویٹ بزنس کا بڑا شیئر ہولڈر ہے۔ تیسرا جنرل ایک بڑے مویشی خانہ کا مالک ہے۔ ایک اور جنرل مغربی جاوا میں غیر معمولی املاک رکھتا ہے۔

مختصر یہ کہ فوج کے افراد غیر فوجی شعبوں میں اپنی پسند کی ملازمتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہیں، بلکہ ایسے حقائق بھی سامنے آتے ہیں کہ وہ دولت اور جائیداد کے حصول میں بے دریغ اپنی پوزیشن بھی استعمال کرتے ہیں۔

انڈونیشیا سے باہر جنرلوں کے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں اور داستانیں سُنی جاتی ہیں۔ انڈونیشیا کی جدید مسلح افواج کے افسروں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ تنومند اور دھوپ کی عینک لگاتے ہیں ایسے وسیع اور کشادہ مکان میں رہتے ہیں جن میں جھاڑ فانوس، مچھلی کے ٹینک، خوبصورت آرام دہ کمرے بنے ہوتے ہیں۔ اور وہ مرسیڈیز ڈرائیو کرتے ہیں۔

مبصرین کی ایک یہ بھی رائے ہے کہ انڈونیشیا کی مسلح افواج میں کچھ "مسٹر بگز" بھی موجود ہوں۔ مگر افسروں کی بڑی تعداد اتنی کرپٹ نہیں ہے جتنے قصے مشہور ہیں۔

فار ایسٹرن اکنامک ریویو کے مطابق بدعنوان جنرلوں پر مشتمل سوسائٹی ہے۔ ایک مغربی ملک کے فوجی اتاچی نے ریمارک دیتے ہوئے کہا" لیکن سارے فوجیوں کو بدعنوان قرار دینا غلط ہوگا۔ زیادہ اچھے مکانات اب بھی شہریوں کی ملکیت ہیں۔"

انڈونیشیا کے بارے میں یہ کہاوت بھی عام ہے کہ اگر آپ بزنس کرنا چاہتے ہیں تو آپ کے کسی جنرل سے تعلقات ہونے چاہئیں۔ لہٰذا اگر کوئی غیر ملکی کمپنی کسی جنرل کی خدمات کے عوض اگر اسے کوئی شاندار مکان خرید کر دیتی ہے تو آپ اس کو ہرگز رشوت کا نام نہیں دے سکتے۔ وہ کوئی غیر قانونی کام نہیں کرتا، صرف ٹیلی فون اٹھاتا ہے اور ضروری اشیا کی فراہمی کے احکامات دیتا ہے۔ بس اور کچھ نہیں۔ کوئی تحریری آرڈر بھی جاری نہیں کرتا۔ لہٰذا اگر وہ "زبانی خدمت" کے عوض کچھ حاصل کر لیتا ہے تو آپ اسے رشوت یا بدعنوانی کا نام کس طرح دے سکتے ہیں۔ نہ ہی آپ اس پر کرپشن کا الزام عائد کر سکتے ہیں۔

نوجوان افسر، پرانے بدعنوان فوجی افسروں سے نالاں ہیں۔ ان کی بزنس، املاک، آمدنی کے ناجائز ذرائع کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اگر بدعنوانیاں جاری رہیں تو مسلح افواج بدنام ہو جائیں گی اور ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا۔"

انڈونیشیا میں مسلح افواج کے جنرلوں اور افسروں کی بدعنوانی کی وجہ، ان کی قلیل تنخواہ بتائی گئی ہے۔ دو ستاروں والے ٹاپ جنرل کو ۲۰۰ ڈالر ماہانہ بمعہ کار اور ڈرائیور بمعہ چاول الاؤنس اور ملازم کی سہولت۔ فوج میں کم تنخواہ کی وجہ سے متعدد باصلاحیت افسر فوج کو چھوڑ کر سول ملازمتوں میں چلے جاتے ہیں۔ فوج کے ڈویژن شراکت میں کاروبار چلاتے ہیں، مثلاً سیاحت روڈ ٹرانسپورٹ، اور اسٹیل کی بزنس ان ہی کے پاس ہے۔ کارپوریشنوں میں فوج کے ساتھ پرائیویٹ کمپنیاں شرکت کرتی ہیں۔ فوج کی بڑی کارپوریشنوں میں سے ایک ویسٹ جاوا سیلیسی وانگی ڈویژن میں ایک پرائیویٹ کمپنی پی ٹی پرو پیلیبٹ شامل ہے۔ یہ کارپوریشن انجینئرنگ تعمیرات اور گاڑیوں کو اسمبل کرنے کا کام کرتی ہے۔ الیسٹ جاوا براوی جایا ڈویژن کے پاس روڈ ٹرانسپورٹ اسٹیل فیبریکٹنگ اور دوسرے شعبے ہیں۔

نوجوان افسران کمپنیوں کے طریقہ کار سے مطمئن نہیں ہیں۔ تاہم وہ اس بات کے بھی حامی نہیں ہیں کہ ان کو حکارتہ کے کنٹرول میں دے دیا جائے۔ ریویو کے مطابق ایک نوجوان افسر نے کہا کہ کمپنیوں کو ٹھیک طرح چلنا چاہیئے۔ اور منافع ایمانداری سے تقسیم ہوتے رہنا چاہیئے۔" نوجوان افسران کمپنیوں کی ضرورت محسوس کرتے ہیں

مالاکنڈ

خواتین نے بیدخل کرنیوالوں کو مار بھگایا

مالاکنڈ ایجنسی کے علاقے میں بے دخلیوں کی وجہ سے بے چینی پیدا ہو رہی ہے جس کی مثال حسب ذیل دو واقعات ہیں۔

موضع تھوہ علاقہ کوپر مالاکنڈ ایجنسی میں محنت کش خواتین نے بہادری اور اتحاد سے ایک کھیت مزدور محمد حسن کی گھر سے بے دخلی کی کوشش، ناکام بنادی بے دخلی کے لیے حیات اللہ خان مجسٹریٹ درجہ اول والے پی اے کی سرکردگی میں پولیس کا ایک بھاری دستہ محمد حسن کے گھر میں گھس گیا لیکن گھر میں موجود سینکڑوں بچوں اور عورتوں نے انہیں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح انتظامیہ کی طرف سے بے دخلی کی کوشش ناکام بنادی گئی۔ دوسرے دن حکام نے محمد حسن کے سسر کو گرفتار کر کے جیل بھیجدیا اور اب اس سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ رہائی کے لیے اپنے داماد کو رہائشی کوٹھ مہیا کرے۔ تاکہ اس کی بے دخلی کی جا سکے۔ گاؤں کی محنت کش خواتین نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ بے دخلی نہیں ہونے دیں گی اور اگر ان کے مردوں نے کمزوری دکھائی تو انہیں بھی گھروں میں داخل نہیں ہونے دیا جائے گا۔

بٹ خیلہ مالاکنڈ ایجنسی کے جن دو دکانداروں کو ایک ماہ قبل مارشل لاء ریگولیشن ۵ اور دفعہ ۱۶ ایم پی او کے تحت گرفتار کیا گیا تھا۔ انہیں تاحال رہا نہیں کیا گیا۔ اگرچہ نہ تو ان کے خلاف سول اور نہ ہی فوجی عدالت میں کوئی چالان داخل کیا گیا ہے اور نہ ہی انہیں کسی عدالت میں پیش کیا گیا ہے یاد رہے کہ پچھلے ماہ بٹ خیلہ بازار میں دو دکانداروں کی بے دخلیوں کے خلاف مکمل ہڑتال رہی تھی۔ اور گرفتار شدہ دکانداروں نے ہڑتال کی رہنمائی کی تھی۔ سول اور فوجی عدالتوں سے ضمانت پر رہائی کی درخواستوں پر کہا جاتا ہے کہ نہ تو ان کے پاس چالان داخل ہوا ہے اور نہ ہی کوئی دوسرے کاغذات موجود ہیں۔ ان غریب دکانداروں کے اہل خاندان کو انتہائی تنگدستی کا سامنا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ خود پولیٹیکل حکام نے رپورٹ کی ہے کہ دکانداروں کی بے دخلیاں نامنصفانہ ہیں۔ لیکن ان کے

باجود ایک ماہ سے غریب دکاندار دل کے یہ رہنما جیل میں پڑے ہوئے ہیں۔

بقیہ : نمیتوں کی ڈائری

سے مطالبہ کیا ہے کہ "ملک میں بی بی سی سننے پر بھی پابندی لگادی جائے۔" انہوں نے اس سلسلے میں یہ موقف اختیار کیا ہے کہ حالانکہ ملک میں سیاسی سرگرمیوں پر پابندی ہے مگر بی بی سی اپنی حرکتوں سے باز نہیں رہتی۔ ملک کی سیاسی صورتحال کے بارے میں بڑے خطرناک اور قابل اعتراض تبصرے نشر کر کے لوگوں کے ذہنوں میں سیاسی انتشار پیدا کرنا اس کا موروثی پیشہ ہے۔

بقیہ : اسلام آباد

پاکستانی مصنوعات استعمال کرتی ہیں۔ ان کے گھروں کے کتے بھی امپورٹڈ غذا سے شوق کرتے ہیں۔ عبوری حکومت کے سربراہ جنرل ضیاء الحق پاکستان سے محبت کرنے والا دل رکھتے ہیں اگر ان کے دورِ حکومت میں یہ سب کچھ ہو گیا تو تاریخ جنرل ضیاء الحق کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ چاہے انہوں نے اس ملک میں جمہوریت کی بحالی کے لئے، اسلام کے فروغ کے لئے اور معاشرہ کی تطہیر کے لئے کتنے ہی نمایاں کام کیوں نہ سر انجام دیتے ہوں۔

ہمیں یقین ہے کہ جنرل ضیاء الحق کو تمام صورت حال کا علم ہوگا۔ ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ انہوں نے برصغیر پاک و ہند میں "ایسٹ انڈیا" کے روپ میں آنے والے برطانوی تاجروں کے طریقۂ واردات کو بھی پڑھا ہوگا۔ برصغیر کو برطانوی نو آبادی بنانے کا منصوبہ لے کر جو انگریز آئے تھے وہ تاجروں کے روپ میں تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے اپنے لئے تجارتی مراعات حاصل کیں اور اس کے بعد کینسر کی طرح پھیلتے گئے اور جب انہوں نے اپنے قدم پوری طرح جما لئے تو تجارت کا چولا اتار پھینکا اور برصغیر کے مالک بن بیٹھے۔ انہوں نے بھی تجارتی مراعات طلب کرتے وقت خوشامد کی حد کر دی تھی۔ اپنی چالاکی عیاری اور مکاری سے کام لے کر ہی حکمرانوں کو پرچایا تھا برطانوی تاجروں نے مغل حکمرانوں کی بیگمات کو تحائف پیش کئے تھے آج کل بھارت بھی اسی ٹیکنیک پر عمل کر رہا ہے۔ کیا کوئی ایسی صورت ہو سکتی ہے کہ اس غلبہ کو روکا جا سکے۔ برصغیر پاک و ہند کی تقسیم ہوئی تو پاکستان کے نام پر دنیا کی تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت ہوئی اور ایک کروڑ کے لگ بھگ افراد نے اپنا وطن چھوڑ دیا۔ یہ منقسم خاندان فطری طور پر اپنے دوسرے اہل خاندان سے ملنا چاہتے ہیں۔ بھارت نے بڑی فراخ دلی سے پیشکش کی ہے کہ وہ ویزا کی سہولت بڑھانے پر رضامند ہے۔ اس سہولت کو بڑھانے میں بھارت پاکستان سے برابری کی بنیاد پر بات کرتا ہے کہ اگر ایک ویزا آفس پاکستان میں ہے تو صرف ایک ہی ویزا آفس بھارت بھی پاکستان کو کھولنے دے گا۔ اگر پاکستان کسی دوسرے شہر میں ویزا آفس کھولنے دے تو بھارت بھی کسی دوسرے شہر میں یہ اجازت دینے کو تیار ہے۔ بھارت کی جانب سے آمد و رفت میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہ کرنے کی پیش کش بڑی معنی خیز ہے۔ پاکستان سے جو بھی شخص بیرون ملک جاتا ہے اسے ۳۰ ڈالر زرمبادلہ دیا جاتا ہے۔ بھارت اپنے کسی شہری کو کم از کم پاکستان آنے کے لئے یہ سہولت دینے کو تیار نہیں ہے۔ گویا ہر جانے والا پاکستانی ۳۰ ڈالر کا زرمبادلہ بھارت چھوڑ کر آئے گا اور بھارت سے آنے والا کوئی بھی شخص اگر لایا تو صرف بھارتی کرنسی ہی ہمراہ لائے گا۔ اس آمد و رفت میں پاکستان کا قیمتی زرمبادلہ مفت میں حاصل ہو جائے گا۔ آمد و رفت کی ہر قسم کی سہولت مہیا کرنے کی پیش کش بڑی پُر فریب ہے۔ ہر محب وطن پاکستانی کو اس کا بغور جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ یہ نہیں کہ اگر پاکستانی حکومت اجازت نہیں دے رہی تو اپنی ہی حکومت کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں کوئی حتمی فیصلہ تو حکومت ہی کرے گی کہ دونوں ممالک کے درمیان آمد و رفت کی کیا مزید بہتر صورت ہو مگر اس سلسلے میں ہمیں قومی مفاد کو پیش نظر رکھنے کی جتنی ضرورت آج ہے پہلے کبھی نہیں تھی۔

بقیہ : نواب شاہ

پتہ چلتا تھا کہ کچھ تخریب کار ریلوے لائن کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ لہذا پولیس نے چالیس پچاس افراد کو جن میں دوست محمد دھامرا، محمد ایوب دھامرا، میر محمد، نذیر محمد جاکی۔ اکبر ڈاہری، ڈاکٹر رشید بھٹی، غلام نبی بلھڑ دوست محمد ڈاہری۔ گل حسن ڈاہری، غلام رسول کا کیپوٹو، نذیر احمد کا کیپوٹو، بابو کا کیپوٹو۔ نیک محمد ڈاہری کے نام قابل ذکر ہیں۔ کو حراست میں لے کر پوچھ گچھ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ پولیس نے پوچھ گچھ کے دوران مبینہ طور پر بے انتہا تشدد کیا۔ لوگوں کو الٹا لٹکایا زدو کوب کیا۔ الغرض تشدد کے بعد سنا ہے کہ پولیس کچھ افراد سے اقبال جرم کرانے میں کامیاب ہو گئی ہے جس کے بعد اس نے باقی افراد کی رہائی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ پولیس کے قبضہ سے آزاد ہونے والے افراد کی زبان بند ہے۔ وہ کچھ کہنے سے گریز کر رہے ہیں لیکن ان کی ویران آنکھیں ان کے جسموں کی حالت، ان کی کپکپاتی ٹانگیں اٹھتے بیٹھتے درد سے نکلنے والی آہ یہ بتانے کے لیے کافی ہے۔ کہ انہیں اذیت ناک تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ انتظامیہ نے ابھی تک اس سلسلے میں خاموشی اختیار کی ہوئی ہے۔ وہ ابھی تک یہ بتانے سے گریز کر رہی ہے کہ شگاف ڈالنے والے اصل مجرم کون ہیں۔ ان کے نام کیا ہیں۔ انہوں نے کیوں شگاف ڈالا۔ پولیس کو اس سلسلے میں کوئی ثبوت ملا بھی ہے یا صرف چند افراد کے اقبال جرم کو ہی انہوں نے کافی سمجھ لیا ہے۔ کیونکہ زیر حراست کیس کے ملزموں کے بارے میں اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں اور ان کی تصاویر کو دیکھ کر لوگوں کو شک و شبہ میں ڈال دیا ہے کہ انہوں نے پولیس کے تشدد سے مجبور ہو کر اقبال جرم کیا ہے۔ کہیں یہاں بھی یہی قصہ تو نہیں ہے کہ تشدد سے مجبور ہو کر کچھ افراد نے شگاف ڈالنے کی ذمہ داری قبول کر لی ہو۔ اس لیے انتظامیہ کو چاہیئے کہ وہ واضح ثبوت کے ساتھ ملزمان کو عوام کے سامنے پیش کرے تاکہ لوگوں کے ذہنوں میں جو شک و شبہات ہیں وہ دور ہو سکیں۔

بقیہ : طیارے کا اغواء

یقیناً معنی خیز تو ہے، لیکن ہائی جیکنگ کی تاریخ کا حصہ نہیں بنتا۔

سوال پھر وہی ہے کہ پاکستان میں اچانک ایسے واقعات کیوں رونما ہونے لگے ہیں۔ کبھی شاہ پور چاکر کے بند صداداہ میں شگاف پڑ جاتا ہے۔ کبھی فوکر طیارہ اغواء ہو کر نور خان ریٹائرڈ ائیر مارشل کو گولی لگنے پر ختم ہوتا ہے اور کبھی جمبو جیٹ ڈیو ہیکل طیارہ ایک آدمی کے ہاتھوں اغواء کی طرف بڑھتا ہے۔ اور "بے ہوش سید حسین کہنے پر مجبور ہوتا ہے۔ مجھے ہوش میں آنے دو۔ میں سب کچھ بتا دوں گا۔"

بات یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ہائی جیکر ہوش میں آنے کے بعد سب کچھ بتا دے گا اور وہ پہلا ہائی جیکر جو پہلے سے ہوش میں ہے کب "سب کچھ" بتانے آئے گا۔ قارئین کو اس کا ابھی انتظار کرنا پڑے گا۔

روپے ماہانہ لے کر یہ نمبردار کسانوں اور ملک کو لوٹ رہا ہے ، جبکہ اس دور میں ایک عام کسان اور مزدور اس رقم سے چھ گنا زیادہ کماتا ہے اور کیا اس مقررہ رقم کے بدلے نمبردار کوئی کام نہیں کرتا ؛ سلطان صاحب نے نمبرداری سسٹم کو غالباً ایک ایسی انڈسٹری سمجھ رکھا ہے کہ جس میں منافع ہی منافع ہے . اگر حقیقت پسندی سے دیکھا جائے تو نمبرداری محض ایک اعزاز ہے نمبردار اپنی عزت کی خاطر بہت کچھ جھیلتا ہے گورنمنٹ کے جو اعلیٰ حکام جب کبھی دیہاتوں کے دوروں پر آتے ہیں تو نمبردار ہی ان کے میزبان ہوتے ہیں اور ان کو اس قسم کی ضیافتوں پر جتنی رقم خرچ کرنی پڑتی ہے اور ان حکام کے جس طرح نخرے سننے پڑتے ہیں وہ لوگ جانتے ہیں اس کے علاوہ اگر سلطان صاحب دیہاتی زندگی سے واقف ہوتے تو انہیں پتہ ہوتا کہ دیہاتی طرز معاشرت میں نمبردار کا کیا مقام ہے اور اس کی کتنی ضرورت ہے گاؤں وغیرہ میں نمبردار ہی کی شخصیت ایسی ہوتی ہے جو تمام جھگڑوں وغیرہ کا مقامی طور پر فیصلہ کرتی ہے اور دیہاتیوں کے مسائل حل کرنے کی پوری کوشش ہوتی ہے علاوہ ازیں ان مسائل کو حکومت کے ذمہ دار حکام کے سامنے پیش کرنے کا کام بھی اسی کا ہوتا ہے . سب لوگ بخوبی جانتے ہیں کہ دیہاتوں میں تعلیم کی کمی کے سبب لوگ اپنے مسائل کے لیے پڑھے لکھے افراد کے کس طرح محتاج ہوتے ہیں . ایسے کاموں میں نمبردار ہی کام آتا ہے اس کے ساتھ ساتھ برادری کی خوشی وغمی کی تقریبات میں جب تک جان نہیں پڑتی جب تک نمبردار اس میں شامل نہ ہو جائے . کیونکہ نمبردار کے علاوہ گاؤں میں اور کوئی ایسی معزز شخصیت موجود نہیں ہوتی - دراصل نمبردار ایک طرح سے ملک کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں جو کہ دیہاتوں کی ذات ، خاندان ، برادری ، اور قوم و ملک کی خدمت کر کے ایک عظیم ذمہ داری سنبھالتے ہیں ۔

میں خود ایک نمبردار تو نہیں ہوں لیکن دیہات کا رہنے والا ضرور ہوں . اس لیے میں سلطان صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی صلاحیتیں کچھ تعمیری کاموں میں صرف کریں . اگر وہ ملک کی تعمیر چاہتے ہیں . اور ملکی نظام میں ایک بنیادی تبدیلی لانا چاہتے ہیں اور کسانوں کی حالت بہتر بنانا چاہتے ہیں تو مزدور کسان پارٹی یا پیپلز پارٹی میں شامل کیوں نہیں ہو جاتے . اپنا ایک علیحدہ پلیٹ فارم بنانا یا تحریک چلانا ملک کی تو نہیں بلکہ ان کی اپنی شخصیت کی تعمیر کی خواہش کو ظاہر کرتی ہے وہ جاگیرداری نظام کے خاتمے کے لیے کام کریں غلط رسوم کے خاتمے کے لیے کام کریں رشوت اور سمگلنگ کے خاتمے کے لئے کام کریں . ملک میں تعلیم پھیلانے کے لیے کام کریں ، جو کہ واقعی تعمیری کام ہیں

محمد عجائب خان - کراچی - ۲۹

بھارت کی اطاعت گذاری میں کیا ملے گا

آج کل تمام اخبارات ہندوستان کے وزیر خارجہ اٹل بہاری باجپائی کے دورے کی تفصیلات اور بیانات سے بھرے ہوئے ہیں - معزز موصوف کا رویہ ہمیں یہ تاثر دیتا ہے کہ ہندوستان کا حکمران ٹولہ ہمارا دوست اور مربی ہے مثلاً دونوں ملکوں کی تجارت تعلقات اور وفود کے تبادلے تک کا نہیں ہے . یہ تمام عمل گزشتہ سے پیوستہ ہے آج سے پہلے جب برطانوی سامراج کا مفاد اس بات میں پوشیدہ تھا کہ پاکستان اور ہندوستان دو الگ الگ منڈیاں وجود میں آئیں تو برصغیر تقسیم ہوا . اور جب آج سامراجی طاقتوں کا مفاد اس بات میں پوشیدہ ہے کہ پاکستان اور بھارت مل کر اپنے عوام کا استحصال کرنے کے علاوہ سامراجی مفادات پورے کریں تو بھارت اور پاکستان کے درمیان سمجھوتے اور نام نہاد دوستی کی لہر چل پڑی . کیا یہ عجیب بات نہیں کہ اہم اور متنازعہ امور کی موجودگی میں ہم بھارت کے اطاعت گزار بنے جا رہے ہیں

آصف شہزاد لاڑکانہ

محنت کش عوام کا سلام

سرمائے کے ارتکاز اور سرمایہ داروں کی ناہمواری نے ملک کی ترقی کو فروغ دینے سے روکا ہے . آپ نے کافی ایمانداری اور ذاتی محنت کو بروئے کار لاتے ہوئے عوام دشمنوں کو بے نقاب کیا ہے اس پر میں آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں بلکہ ملک کے تمام محنت کش عوام آپ کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں . آپ نے ہمیشہ پسماندگی کے خلاف جدوجہد کی ہے دولت اور طاقت کی غیر مساوی اور غیر منصفانہ تقسیم پر اعتراض کیا ہے اس لیے جریدہ کی شہرت بڑھ رہی ہے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ آپ کو ہمیشہ حقیقت پیش کرنے کی توفیق عطا فرمائے

محمد کریم بیردان - مکران

بلوچستان میں اسکولوں کالجوں اور ہسپتالوں کی حالت زار

بلوچستان کے اسکولوں ، کالجوں اور اسپتالوں کی حالت تشویشناک ہے . تمام اسکولوں اور کالجوں میں سائنسی آلات اور اساتذہ کی سخت قلت ہے . کالجوں میں لیباٹری روم نہیں ہے . پریکٹیکل کرنے کے لیے کوئی سہولیات نہیں ہیں جس سے طلبا کو کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے یہاں تک کہ بلوچستان کے کالجوں میں فزکس ، کیمسٹری اور بیالوجی کی کتابوں کا ملنا مشکل ہے کالجوں میں بلڈنگ نہیں ہے طلبا کھجور کے سائے میں بیٹھ کر پڑھتے ہیں جب یہ سائے ایک دو گھنٹے کے بعد ختم ہو جاتے ہیں تو طلبا چھٹی کر کے واپس اپنے گھروں میں آتے ہیں کیونکہ کالجوں میں کمروں کی سہولت نہیں ہے کہ طلبا کمروں میں بیٹھ کر پڑھ سکیں جس سے طلبا کا قیمتی وقت ضائع ہو جاتا ہے ان حالات کے باوجود طلبا بڑی محنت سے تھرڈ ڈویژن میں ایف ایس سی کر لیتے ہیں مگر ان حالات کے باوجود طلبا کے ساتھ ناانصافی کی جاتی ہے اور میڈیکل میں داخلہ کے لیے پریشانیوں سے دوچار رہتے ہیں اور طلبا کو ہر طرح سے تنگ کیا جا رہا ہے اب رہا اسکولوں کی حالت تو ان کی حالت کالجوں سے بدتر ہے تمام سیکنڈری اسکولوں میں چار یا پانچ اساتذہ سے زیادہ نہیں ہیں اور یہ بھی ایف اے یا بی اے پاس ہیں - اسکولوں کی عمارت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا - یہاں کے طلبا نے اپنی طرف سے اسکولوں اور ٹیچروں کی رہائش کے لئے دو دو جھگیاں بنائی ہیں - ان جھگیوں میں طلبا بڑی مشکل سے پڑھتے ہیں طلبا اور اساتذہ کئی قسم کی پریشانیوں میں مبتلا ہیں - اسپتالوں کی حالت کا تو ذکر ہی کیا . بلوچستان کے اکثر علاقوں میں اسپتال ہی نہیں ہے اگر کسی علاقے میں ایک ڈسپنسری ہے تو وہاں پر ادویات کا نام و نشان نہیں ہے . اور ڈاکٹر ایک کمپاؤنڈر تک محدود ہے جس سے بلوچستان کے عوام علاج و معالجہ کے لئے سخت پریشان ہیں . میں حکام سے ایک سوال پوچھتا ہوں کہ کیا طلبا کو سائنسی سامان ، ٹیچر کالجوں اور اسکولوں میں بلڈنگ اور دوسری بہت سی سہولتوں کا حق نہیں ہے کیا بلوچستان کے مظلوم اور غریب عوام کو اپنے علاج معالجہ کے لئے ادویات اور ڈاکٹر کا حق نہیں ہے ؟ اگر ان کو حق ہے تو بلوچستان کے تمام اسکولوں اور کالجوں میں سائنسی آلات اور ٹیچر فوری طور پر مہیا کیے جائیں . بلوچستان کے تمام اسکولوں اور کالجوں میں بلڈنگ ، ہوسٹل اور دوسری سہولیات دی جائیں جو پاکستان کے دوسرے صوبوں کو ملتی ہیں . تمام اسپتالوں میں ادویات کی قلت کو فوری طور پر دور کیا جائے اور تمام دیہی علاقوں میں ایم بی بی ایس ڈاکٹر تعینات کیے جائیں .

بہرام خان . بلوچ جوائنٹ سیکریٹری
بی ایس او عوامی گروپ کراچی

بائیں بازو کا المیہ

شمارہ ۷ ، ۱ جنوری تا ۳ ، فروری ۸ ، ء میں بائیں بازو کے اتحاد میں رکاوٹ کے عنوان سے ایک خط شائع ہوا تھا . یہاں پر اس پر جواب الجواب کے طور پر بحث مقصود نہیں ہے بلکہ کچھ حقائق کے بارے میں عرض کرنا چاہتا ہوں - پاکستان کے بائیں بازو کی تحریک کمیونسٹ پارٹی پر پابندی عائد ہونے کے بعد سے تنکری اور تنظیمی انتشار کا شکار رہی . گو آزاد پاکستان

پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی نے اس کو تنظیمی اور فکری پلیٹ فارم مہیا کرنے کی کوشش کی مگر یہ دونوں پارٹیاں کسی بھی طرح محنت کشوں کے نظریات کی نمائندہ پارٹیاں نہ ہونے کے سبب مزید انتشار کا باعث نہیں - اور بائیں بازو کی تحریک گروہ بندی اور مخاصمانہ رویہ کا شکار ہو کر ملکی سیاست میں اپنا مثبت طرز عمل کھو بیٹھی . سقوط مشرقی پاکستان کے بعد مغربی پاکستان نیشنل عوامی پارٹی اور بھی چھوٹے گروہوں میں تقسیم ہو گئی ان گروہوں کے درمیان نظریاتی اختلافات نہیں بلکہ ذاتی اختلافات نمایاں تھے . حالیہ برسوں میں بائیں بازو کی تحریک کا یہ المیہ رہا ہے کہ یہ اپنا تشخص برقرار نہیں رکھ سکی . اور ملکی سیاست میں سرمایہ دارانہ سیاست کا دم چھلہ بن گئی ہے . بہت دور جانے کی ضرورت نہیں ہم ماضی قریب میں اس کا مطالعہ کر سکتے ہیں . ہمارے خیال میں موجودہ وقت بائیں بازو کے اتحاد کے لیے بہت موزوں ہے اور بائیں بازو کا اتحاد وقت کی اہم ضرورت ہے .

محمد اقبال اعوان . کراچی .

آپ کا ہفت روزہ پسند ہے

میں نظریاتی طور پر سرمایہ داروں کا مخالف ہوں . اور آپ کا ہفت روزہ اس سلسلے میں میری بڑی مدد کر رہا ہے . مگر میں ایک بات کو بڑی شدت سے محسوس کرتا ہوں وہ یہ کہ "الفتح" میں کچھ علاقائیت کا عنصر شامل ہے اس عنصر کو ختم کر دینا چاہیئے ہم کو "سیاست" علاقائیت سے ہٹ کر پاکستان کی سطح پر کرنی چاہیئے اگر ہمیں کسی مسئلے پر غور کرنا ہے تو پہلے پاکستان کو مدنظر رکھیں . ہم کو اپنے علاقوں سے بھی محبت کرنی چاہیئے . کیونکہ ان چاروں عناصر سے مل کر پاکستان کا نام وجود میں آیا . میں آپ کے رسالے سے اس لئے بھی خوش ہوں کہ یہ ایک بے باک نڈر لوگوں کا رسالہ ہے میں "امر جلیل" کی سندھی میں لکھی ہوئی کتابوں کو کافی پڑھتا ہوں . اور امر جلیل صاحب میرے آئیڈیل ہیں . آپ سے ایک گذارش ہے کہ آپ ملک کی معاشی پوزیشن کو عوام کے سامنے بے نقاب کریں . سرمایہ داروں کی سازشوں کو عوام کے سامنے لائیں . اگر آپ اپنی قلم کی قوت بروئے کار لائیں اور پاکستان کے محکمہ جات کی برائیوں کو بے نقاب کریں .

مہتاب عالم خان - سکھر .

Regd. No. S-2772

Weekly "Al-Fatah" Karachi

کرناٹک اور آندھرا میں اندرا کی جیت

رپورٹ صفحہ ۲۶ پر ملاحظہ فرمایئے